# حکایت نیم شب

## افسانوں کا مجموعہ

## غنی غیور

زیر اہتمام



HIKAYAT-E-NEEM SHAB (AFSANON KA MAJMUA)
WRITER : Eng. Abdul Ghani Jagil (Ghani Ghayoor)
Edition : 2016
Rs. : /-

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | حکایت نیم شب (افسانوں کا مجموعہ) |
| مصنف | : | عبدالغنی جاگل |
| قلمی نام | : | غنی غیور |
| رابطہ | : | |
| کمپوزنگ | : | سعید احمد معروفی 9560062765 |
| تعداد | : | |
| صفحات | : | |
| سن اشاعت | : | 2016 |
| قیمت | : | روپے |
| مطبع | : | |
| ڈسٹری بیوٹر | : | |

Published by

# انتساب

ہر دلعزیز افسانہ نگار و میرے محسن و بزرگ دوست

جناب مشرف عالم ذوقی

کے

نام



# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | پیش لفظ | | ۷ |
| ۲ | تاثرات اور آراء | | ۱۳ |
| ۳ | قسط اول | مقدم کالو | ۵ |
| ۴ | دوئم | // // | ۹ |
| ۵ | سوئم | // // | ۱۳ |
| ۶ | چہارم | // // | ۱۷ |
| ۷ | پنجم | // // | ۲۲ |
| ۸ | ششم | // // | ۲۶ |
| ۹ | ہفتم | // // | ۳۱ |
| ۱۰ | ہشتم | // // | ۳۶ |
| ۱۱ | نہم | // // | ۴۰ |
| ۱۲ | دہم | // // | ۴۴ |
| ۱۳ | گیارہویں قسط | // // | ۴۹ |
| ۱۲ | بارہویں قسط | // // | ۵۳ |
| ۱۳ | تیرہویں قسط | // // | ۵۷ |
| ۱۴ | چودھویں قسط | // // | ۵۹ |
| ۱۵ | پندرھویں قسط | // // | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۵ | قسط اول | کھکھا چوھڑا | ۶۲ |
| ۱۶ | دوئم | // // | ۶۵ |
| ۱۷ | چاندنی | کہانی | ۶۹ |
| ۱۸ | سیکنڈ ڈویژن | مختصر افسانہ | ۷۳ |
| ۱۹ | ڈینگی مچھر کی نئی نسل | کہانی | ۷۵ |
| ۲۰ | ایئربڈز ( Ear | افسانہ | ۷۷ |
| ۲۱ | پچھلا حساب | افسانہ | ۸۰ |
| ۲۲ | شربتی کی روح | افسانہ | ۸۴ |
| ۲۳ | کینکر وارمز (Conker worms) | افسانہ | ۸۹ |
| ۲۴ | دو مفرور لڑکے | کہانی | ۹۱ |
| ۲۵ | سرمد کا قتل: صوفی کی موت | کہانی | ۹۶ |
| ۲۶ | پنجرے کا قیدی | افسانہ | ۹۹ |
| ۲۷ | پنڈت کیلا رام | کہانی | ۱۰۱ |
| ۲۸ | سائیں نیلا | کہانی | ۱۰۴ |
| ۲۹ | زنانہ تکرار | مائکروفکشن | ۱۰۷ |
| ۳۰ | گھورے پر اگے ہوئے پھول | // // | ۱۰۸ |
| ۳۱ | بچے دیواروں پر چلتے ہیں | // // | ۱۰۹ |
| ۳۲ | کاکروچ | // // | ۱۱۱ |
| ۳۳ | خوفناک آوازیں | // // | ۱۱۳ |
| ۳۴ | رات اور بھوت | // // | ۱۱۵ |
| ۳۵ | بے زباں گدھا | افسانہ | ۱۱۶ |





| | | | |
|---|---|---|---|
| ۳۶ | قسط اول۔ چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ | حکایت | ۱۱۸ |
| ۳۷ | دوئم // // // | // | ۱۲۰ |
| ۳۸ | سیلاب زدہ بستیاں | کہانی | ۱۲۲ |

# مژدۂ بہار

برصغیر کی بالعموم اور کشمیر کی بالخصوص ثقافتی میراث قبل از تاریخ زمانے سے وہی رہی جو آج ہے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس نے ہمالیہ کی تازگی، بشاشت اور زندہ حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہوئی بہتی ہوئی مٹی کی مہک کو جلو میں سموئے ہونے کے باوجود در آنے والی نئی تہذیبوں سے بھی روشنی اخذ کی۔ جب میں نے غنی غیور کے چند حکایتی افسانے پڑھے تو میرا یہ احساس یقین کی حد تک میری فکری فہم کا حصہ بن گیا۔

جب ہم غنی غیور کا ذاتی پسِ منظر دیکھتے ہیں تو ہمالیہ کی گود میں رچی بسی جنتِ بے نظیر لداخ کی سرزمین سے اٹھا ان کا خمیر اپنے بچپن سے ہوتا، تعلیمی سرحدوں سے گزرتا ہوا سن شعور کو پہنچتا ہے تو وہ اپنی ادبی اور فکری دانش کو انہی ثقافتوں سے مزین کرتا ہے۔ یوں تو بظاہر لداخ اس خطے کا ایک اہم حصہ ہے۔ شمال میں چین اور مشرق میں تبت، لیکن اس کی اپنی تاریخ بھی انتہائی تابناک ہے۔ پہلی مغربی تبتیین ڈائنسٹی سے نامبغال تک کی تاریخ سے روشن آرٹ اور کلچر کے بہتے ہوئے دریا، بدھ مت سے ماڈرن ہسٹری تک کے سکھ حکمرانوں اور دردھان شاہی گھرانوں کے لسانی، تمدنی وتہذیبی اطوار لداخ کے باسیوں کی روح میں رچ بس گئے ہیں...... بارہویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے علاقائی ثقافت اپنے رنگ بدلتی ضرور ہے لیکن اس کی مہک اور جوہری ہیئت اپنے عناصر میں نئے ابھرتے فکری افق پر اجنبی اور پیچیدہ سوالات کا نہ صرف ادراک رکھتی تھی بلکہ ممکنہ حد تک تشفی بھی کرتی تھی۔ اسی پس



منظر میں غنی غیور ان تاریخی حوالوں سے اٹھے بلند و بالا ادبی برجوں میں اپنی لوکیل سے جڑت رکھتی ہوئی تہذیب کی ایک ایسی اکائی کی طرح ہیں جو کل میں اپنے وجود کا درماں بھی رکھتے ہیں۔

ستم یہ ہوا کہ یہ بیسویں صدی کی ارتقائی سیاست کی عطا کردہ محرومیوں اور کثافتوں نے ہمیں خوابوں اور نعروں کی دنیا سے نکال کر ایسی سنگین دنیا میں لا کھڑا کر دیا جس میں ماضی کا متحیر کر دینے والا کوئی خواب اور نظریہ سکون کا باعث نہیں بنا۔ ویرانی، پشیمانی اور دیکھے خوابوں کی ان دیکھی تعبیر کے سوا ہماری نسل کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ ایک طرف آزادی کا خواب اور دوسری طرف ثقافت اور کلچر کو عقیدے کی بنیادوں پر تقسیم کے سوال اٹھ چکے تھے اور پھر ایک نہایت درماندہ ماحول میں وسطی دہائیوں میں اس سرزمین پر جنم لینے والی روحوں نے وقت کو سنبھالا دیا۔ کشمیر کی تقسیم کے بعد ظہور میں آنے والی نسل نے جوان ہوتے ہی اپنے شعور کی ابتدائی منزل سے اپنے چاروں طرف درماندگی دیکھی۔ یہی وہ وقت تھا جب بیسویں صدی کے آخر سے اکیسویں صدی کے آغاز تک غنی غیور نے اپنی تحریروں سے ایک نئی دنیا آباد کی۔ ان کے ہاں علامت سے وجودیت کا سفر ایک نئی روشن دلیل کی نوید دیتا ہے۔

دراصل غنی غیور کو بھی ایک ایسا ہی اجالا ملا تھا جو تاریکی میں الجھا ہوا تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کسی چکنی اور پختہ شاہراہ پر ایک بار بھی بھاری بھرکم ٹینک گزر جائے تو اس کے نشانات مدتوں قائم رہتے ہیں۔ اس طرح ہمارے یہاں معاشرے کی صدیوں پرانی تہذیب پر مغربی لسانی اور ثقافتی یلغار، کالونیزم اور دونوں عالمی جنگوں نے چاروں طرف ایک کثیف سا دھواں پھیلا دیا تھا جس سے وہ تہذیب قدرے مرجھا گئی جو نسل در نسل اپنی ثقافت کو سینے سے لگائے تمام تر شعوری کوششوں سے گہنا نہ پائی تھی۔

یہی وہ لمحات تھے جب وقت کے ساتھ ساتھ دلوں میں مچلتی زندگی اور فکر کی جولانی مقید ہوکر ایک ایسے دکھ کا نغمہ بن گئی جس میں ذات، حیات، ممات، تہذیب و تقدیر سمیت سبھی کچھ تحلیل ہوکر ناسور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ گو عالمی سطح پر ابھرتے جدیدیت کے نئے ادبی رنگ اور ان کی تابناک روشن کرنیں ایشیا کو بھی خیرہ کر رہی تھیں لیکن غنی غیور اپنی روایت وثقافت سے جڑے اپنی معرکۃ الآراء کہانی ''مقدم کالو'' میں وہ کچھ سچائی کے ساتھ لکھ جاتے ہیں جسے لکھنے کے لیے کئی ایک قلم کار متزلزل رہتے ہیں۔

اس فکری وذہنی ناآسودگی اور تلخیٔ حیات میں بھی وہ کوئی لکشا نغمہ، حقیقی مسرتوں میں ڈوبی آواز اور کسی آدرش کے زیر اثر بنائی ہوئی اپنی جنت آباد نہیں کرتے ہیں بلکہ علامتی پیرایہ میں ان کا استدلال ایک روشن صبح کی نوید دیتا ہے۔ وہ کوئی مدھر نغمہ نہیں سناتے لیکن اپنے افسانے ''پچھلا حساب'' میں اپنی بات پورتوانائی اور جرأت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ اسی فن کی انتہا ان کی دیگر حکایتی کہانیوں میں بھی مخفی ہے۔ ''خراٹے، ہمدرد اور بلی کا اشتہار اور اعلانِ حج'' ان کے چند ایک اچھے علامتی افسانے ہیں۔

ان کا فنکارانہ شعور گہرا اور مشاہدے کی قوت اتنی سیماب صفت ہے کہ ان کا ادبی وجدان فوراً ہی ان کے مشاہدات اور فہم وفکر کو داستانوی علامتی روپ میں ڈھال دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ غنی غیور کے ہاں موضوعات کا متنوع ہونا کوئی اچنبھا نہیں۔ ان کے حکایتی افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ''حکایت نیم شب'' انہی ادبی روایتوں کا امین ہوتے ہوئے کائنات کی عقدہ کشائی میں جتنا مددومعاون نظر آتا ہے مجھے اس کا اعتراف بھی کرنا ہے۔

نعیم بیگ۔ لاہور پاکستان

۵ جون، ۲۰۱۶ء



# پیش لفظ

(میرا: تعارف، فن اور ادبی نظریہ)

قطعہ

قلم ہڈیاں، خونِ دل روشنائی
رقم صفحۂ ہستی پر داستاں ہے
غنی دست بردِ زمانی سے محفوظ
کرم خردہ کاغذ پہ باقی نشاں ہے
— غنی غیور

میرا قلمی نام غنی غیور ہے اور اصلی نام عبدالغنی جاگل ہے۔ ''جاگل'' میرا ٹائٹل کوئی آسمان سے نہیں اترا بلکہ جب کہیں انسانیت خانوں میں بٹی تھی قومیت کا رواج تھا تو ہمیں بھی یہ دم لگ گئی تھی۔ میں اپنی کئی خامیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے بارہ میں اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ مجھے لکھنے پڑھنے شعر وشاعری کا شوق والد مشفق سے ملا اور اپنی مہربان والدہ سے سخاوت ورحم دلی ملی۔

میرا تعلق گاؤں کے غریب خاندان سے ہے۔ لیکن میری ہنسی ومذاق نے مجھے کبھی غربت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اور اچھے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے کوشش کے باوجود اتنا امیر بھی نہیں ہوسکا ہوں کہ اپنی ہنسی مذاق کو روک پاؤں یا مجھے اسکی ضرورت

محسوس نہ ہو۔لوگ میری زندہ دلی کا ثبوت میری ہنسی مذاق کو سمجھتے ہیں اور میری ہستی کے شواہد،منفرد انداز بیان ومخصوص طرزِتحریر کو۔

اور بعض دوست میرے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کے چہرے پر فرح کی حالت ہو یا غم کی،کوئی مدح کرے یا ذم۔آپکے چہرے کی حالت ایک جیسی رہتی ہے۔اور اس پر طرہ یہ کہ ظاہر و باطن بھی تقریباً ایک جیسا ہے۔لیکن یہ سو فیصدی درست نہیں۔

میرے گھر والوں کا میرے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یہ خلوت پسند آدمی پچھلے تیس سال سے ٹی وی نہیں دیکھتا۔اور جلوت میں ہوتے ہوئے بھی خلوت نشین ہوتا ہے۔جاگتے دوڑتے ہوئے شہر اسکو جنگل کی مانند ساکت واجاڑ دکھائی دیتے ہیں۔خیالی ہوں لیکن اتنا خیالی بھی نہیں ہاں یہ سچ ہے کبھی کبھی اپنی قمیص کے بٹن بند کرنا بھول جاتا ہوں۔

استادوں اور پروفیسروں کو مجھ سے یہ شکوہ رہتا ہے کہ ”یہ شخص ہماری عظمت کا سرے سے قائل ہی نہیں اور نصابوں سے بھی دلچسپی نہیں رکھتا۔یہ بات کسی حد تک صحیح ہے۔مگر پوری طرح درست نہیں۔میں کچھ حقیقی استادوں اور علم دوست پروفیسروں کی عزت کرتا ہوں وہ اس لئے کہ دنیا کے زیادہ تر اساتذہ اپنے شاگردوں کو فقط اپنے جیسا بنانے کے پابند ہیں۔میں سمجھتا ہوں وہ اپنے شاگردوں کو اپنا مقلد تو بنا سکتے ہیں لیکن مجتہد نہیں۔کیونکہ ان میں بیشتر حضرات خود بھی تخلیقی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔

زباں وادب کے بارہ میرا نظریہ صاف ہے۔کئی بار یہ کہہ چکا ہوں۔زبان کو عوام کے پیچھے چلنا ہے،عوام کو زبان کے پیچھے نہیں چلنا۔زندگی کی طرح زبان کو جیسا بھی لباسِ بیان دیا جائے۔وہ کچھ ہی سالوں دہائیوں میں گھس پٹ کر ختم ہو جاتا ہے اور



پھر اسے ایک نئے لباس،نئی تشریح،نئے الفاظ اور نئے اظہار کی ضرورت پیش آتی ہے۔

میرے لکھنے کا انداز روایتی نہیں اس لئے ہوسکتا ہے بعض لوگ اسے پہلے سے بنائے گئے تنقیدی یا ساخت کے پیمانوں کے ذریعے ماپنے میں ناکام بھی ہوں۔مجھے کوئی خدشہ نہیں اور نہ ہی کسی کی کوئی پروا۔میری تحریروں میں انہیں اگر اور کچھ نہ بھی ملا مگر وہ ان میں میری پہچان کے الگ جیسے خط وخال ضرور پائیں گے۔مجھے امید کہ میرے نقاد میری تنقید کا اتنا حق تو ضرور ادا کریں گے۔

مزید ہر ایسی تخلیق جس میں زندگی کی سچائیوں کو قصہ یا کہانی کا غلاف یا نقاب چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کو میں فکشن سمجھتا ہوں۔

الن مور نے کیا ہی خوب کہا تھا۔”قصہ یا کہانی وہ جھوٹ ہے جس کے ذریعے ہم سچائی کا اظہار کرتے ہیں۔“

اگر دیکھا اور سوچا جائے تو کہانی کی ابتدا ہی مستبد حکمرانوں کے دور میں ذہین و طباع ادیبوں نے اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے کی تھی۔مختصر علامتی کہانیاں اس سلسلے کی سب سے پرانی کڑیاں ہیں۔کہانت کے دور میں لکھے گئی مقدس یا غیر مقدس کتابوں میں یہ صنف بدرجۂ اتم موجود ہے وہ کتابیں آج بھی فکشن کے ادبی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میرے نزدیک فکشن نگار وہ جولاہے جو اپنے منفی و مثبت خیالوں پر مبنی مواد یا تاثرات کو تانے بانے کی طرح اپنی تخلیق میں بنتا ہے۔فکشن میں خیالات اور اندیشے سماوی فرضی خیالی ہوتے ہوئے بھی زمین سے علاقہ مند ہوتے ہیں۔اس کو کسی ایک دور سے وابستہ کرنا یا اس تک محدود سمجھنا درست نہیں۔فکشن نے ہر عہد میں قصے لوک کہانیوں کتھاؤں اساطیر کی شکل میں ذہنی و فکری ٹرانفارمیشن

Transformation کا زبردست کام کیا ہے۔

فکشن کی اہمیت اس سے عیاں ہے یہی کہ دو تین سال کا بچہ بھی سب سے بھلے کہانی سننا پسند کرتا ہے۔انسان حیوانات پرندے جمادات نباتات سماوات الغرض ہر مرئی شی انسانی ذہن پر اثرات مرتب کرتی ہے اشیا کی بے ثباتی اور ان سے متعلق تغیرات ہی فکشن لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہر انسان کی ہر عہد میں زندگی اگر غور کیا جائے تو وہ حقیقت ہوتے ہوئے بھی آخر افسانہ بن کر رہ جاتی ہے ثابت یہ ہوتا ہے کہ فکشن زندگی کی جز ولاینفک ہے۔خاص لوگوں کے علاوہ عوام بھی کسی نہ کسی طرح فکشن کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بے شک فن کار اسکے ذریعہ تلخ سچائیوں کی افزائش ونمائش کرتے ہیں۔اس عہد کے افسانوی ادب تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بقول شخصے ''افسانہ میں بیانیہ کی بحالی ہوئی ہے، کہانی پن کا استرداد اب نظریاتی طور پر قابل قبول نہیں۔

افسانہ قاری سے جڑ رہا ہے،اجنبیت، بیگانگی، لایعنیت تنہائی، شکست ذات کے دئے ہوئے فارمولے پوری طرح رد ہو گئے ہیں۔کوئی نظریاتی فارمولا قابل قبول نہیں کیونکہ ہر نظریہ ادعائیت کی طرف لے جاتا ہے۔

تانیثیت ، پوسٹ کولونیل سیاسی سماجی مسائل، دلت، ذات پات، اقلیتوں کے مسائل، معنیاتی نظام فن کی تکثیریت کے علاوہ تہذیبی جڑوں، مقامیت پر اصرار، یہ سب آج کے نئے افسانوی ادب کے خدوخال ہیں......''

مائکروفکشن اردو ادب میں نئی نئی وارد ہوئی ہے اگر اسکے بانی مبانیوں کے ساتھ میرا نام بھی جوڑا جائے اور جوڑنا چاہئے بھی۔سید تحسین گیلانی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ ساتھ میں پیش پیش رہا ہوں اور آگے بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

اسی طرح اردو کی اس نئی صنف کے بارہ میں کسی نے مجھ سے بھی وضاحت مانگی گئی



تھی جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مائکروفکشن کا روشن مستقبل ہے اور میں نے ''انہماک'' کے لئے ایک مختصر سا یہ مضمون لکھا تھا۔

مائکروفیشن اجمال واختیار کا متقاضی ہے۔ یہ بحر محیط ہونے کے بجائے ایک قسم کی تنگنائے ہے جس میں انشائیہ کے برخلاف شیرہ کشی اور عرق ریزی پر زور دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ وہ کارِ برجستہ ہے۔جس میں کہانی کار کو کفایت لفظی سے اپنے فن پارہ کو موثر انداز میں پیش کرنا شرط اول ہے......تاکہ کہانی کو وحدت اثر کے ساتھ چند منٹوں میں پڑھا جا سکے۔اردو میں اسکے الفاظ کی تعداد تین سو پانچ سو کے بیچ میں ہو سکتی ہے۔اگر الفاظ ۳۰۰ سے کم بھی ہوں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس افراتفری کے دور میں قلت وقت اور مشغولیت کثیر جیسی وجوہات کی بنا پر اس صنف کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔اور جدید ادب میں اس صنف کے پنپنے کے وسیع تر امکانات ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے مائکروفکشن کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا خالق آزادی کے ساتھ ذہن پر تیرتے ہوئے خیالات کو دلکش انداز میں کہانی کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتا ہو افسانے کی طرح غرض و غایت کے علاوہ موضوع اصلی/ بنیادی خیال اور محل ہدف وحدت اثر وغیرہ کا ہونا بی حد اہم ہے۔

کہانی لکھنے کے انداز کئی ہو سکتے ہیں تمثیلی علامتی، تشبیہی فجیعی (دہشت آفریں و خوفناک) پرستانی تصوراتی ماورائی روحانی وغیرہ

وحدت اثر اور اختصار و ایجاز ہی مائکروفکشن کے عناصر ہیں۔مختصر افسانہ اور مائکروفکشن، ناول کی خامیوں مثلاً وحدت اثر کی کمی اور طوالت وغیرہ کے تدارک کہئے یا پھر رد عمل کے طور پر وجود میں آیا ہے......

فکشن میں علامت کی تکنیک بھی اجمال کے پیش نظر ہی وجود میں آئی تھی لیکن اردو

میں اس کا دائرہ محدود کیا جارہا ہے لوگوں نے اسے Riddle or Enigma پہیلی یا چیستان سمجھ لیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ حد سے زیادہ ابہام بدمزگی پیدا کرتا ہے۔

خیال رہے کہ ایجاز و اختصار بھی ترسیل میں رخنہ انداز نہ ہوں اور علامتوں کو استعمال کرتے وقت ترسیلی قرینے بھی مہیا کئے جائیں ورنہ علامتیں، علامتیں نہیں رہیں گی بلکہ وہ تو Pitfalls چور گڈھے بن جائیں گی۔

کہانی کار کے لئے کمال تخیل وتصور کے علاوہ جدت پسندی اور ایجادی قوت کا ہونا بھی از بس ضروری ہے۔کہانی کا آغاز کسی بڑے آنکڑے اور اختتام اسے عجاب و حیرت پر اس کو مؤثر تر بنا دیتا ہے۔مائکروفکشن بظاہر چھوٹی سی کہانی لگتی ہے مگر اس صنف کے لکھنے کے لئے زبردست مہارت اور وسیع ذہنی اپچ کی ضرورت ہے۔

یاد رہے مائکروفکشن بنیادی طور پر مختصر افسانہ یا شارٹ شارٹ سٹوری ہے اس آپ ویری شارٹ سٹوری بھی کہہ سکتے ہیں۔نقادوں کے مطابق جدید مختصر کہانی کا افق، ''دانشوری اور کہانی کا خوبصورت امتزاج'' دریافت ہو چکا ہے۔

رباعی

علمی گفتگو کرکے نادم ہونا
''اک جرم'' ہے جاہلوں میں عالم ہونا
منزل پہ پہنچنا بات ہے دور کی
اعزاز یہ کچھ کم نہیں عازم ہونا
—— غنی غیور



قسط اول

# مقدم کالو

## ستانزن ......یادوں کے دھندلکے

لداخ جغرافیائی طور پر الگ قسم کا خطہ ہے بے آب وگیاہ اور کٹے پھٹے پہاڑوں کے بیچ میں دور دور واقع چھوٹی چھوٹی آباد بستیوں پر مشتمل ہے۔بعض آبادیوں کے بیچ میں کم وبیش 200 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔پرانے وقتوں میں رسد و رسائل کے ذرائع بڑے ہی روایتی اور محدود تھے، حیرت کی بات ہے یہ لوگ کیسے ہلکی پھلکی غذا جو کے ستو کھا کر اور بعضے چھنگ پی کر ہزار ہا سال سے اسی طرح زندہ ہیں......اس کم پیداوار والے سرد ریگستان پر ستانزن کے پرکھوں نے معاشی معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے چندشوئی یا چندشوہری کی رسم قائم کی تھی۔چند شوہری، یعنی ایک عورت کے ساتھ اسکے شوہر علاوہ اسکے تمام چھوٹے بھائیوں کے جنسی تعلقات کو جائز رکھا گیا تھا......بعض پرانی عورتیں رشتۂ چندشوہری پر فخر محسوس کرتی تھیں۔مجھے انکا یہ طنز دوسری اقوام کے برخلاف تعجب خیز نہیں لگا......جہاں کثیر زوجی یا چند زوجی، کو جائز سمجھا جاتا ہے جب ان اقوم کے آلۂ تناسل کو چندنسوانی

فرجوں میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روکتا تو پھر ان چند سخت جان ساکنان کہسار کے مردوں کی تسکین جنسی کو کسی ایک فرج سے باندھ دینا کوئی خلاف عقل بات نہیں۔ لداخ میں زیادہ تر لوگ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بڑی آبادی مسلمانوں میں شیعہ لوگوں کی ہے یہ لوگ زیادہ تر آغا علماء مجتہدین کے تابع ہیں۔ان کے کئی مسلک ہیں......سنی آبادی برائے نام ہے یہاں کے لوگ باہر والوں کے ساتھ کم ہی ملتے جلتے ہیں۔اس طرح انہوں نے اپنی رسموں اور نژاد کو گڈ مڈ ہونے سے بچا رکھا ہے......لوگ منگلونین اور چائنیز (Mangolian and chainese) کے بیچ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں......ابھری ہوئی بڑی بڑی گول آنکھیں چپٹا چہرہ بیٹھی ہوئی ناک کے نتھنوں میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں دکھائی دیتی البتہ سرسری کی طرح سانس چلتی رہتی ہے۔قد بھی چھوٹے البتہ پٹھے گورکھوں کی طرح مضبوط ہوتے ہیں......جلد کا رنگ پیلا البتہ گالوں کے ابھاروں پر جنگلی گلاب کی رنگت دلوں کو متاثر کرتی ہے......

ان لوگوں کے جسموں پر بال نہ ہونے کے برابر ہیں......مسام ہی کم ہیں...... ویسے ان یخ بستہ پہاڑوں پر پسینہ کیسے آسکتا ہے............ بقائے اصلح کے تحت ان لوگوں نے اپنے قدرتی ماحول کو اپنا لیا ہے۔اللہ نے انہیں شیو، ٹریمنگ۔اور بال اکھاڑنے کی مشقت سے بہت حد تک بچا رکھا ہے......

انکے برخلاف وادی کے باریک خدوخال والے بعض سیاہ چشم لوگوں کے اجسام پر میمنوں کی طرح بال دیکھ کر حیرت زدہ ہوں......بہر حال اسی قبیلے کا ستانزن نامی لڑکا ہمارا خادم خاص تھا اسکے علاوہ جمیل دراسی بھی تھا دراس کے لوگوں کے چہرے سردی سے جلے ہوئے الگ دکھائی دیتے ہیں۔غالباً سائبریا کے بعد دراس لوگوں سرد ترین رہائشی ٹھکانہ ہے...... مجھے ان کی پولو اور گھوڑ سواری اچھی لگی یہ لوگ پانی کھر کے



سینوں کی طرح بلند اخلاق ہیں......

ستانزن کا تعلق کرگل کے ایک گاوں سے تھا جہاں بدھا کا مجسمہ بڑی چٹان میں آج بھی کنندہ موجود ہے۔لیکن اسکی محبوبہ کا تعلق بدھ کھربو سے تھا......وہ اکثر مجھ سے چھٹی مانگتا رہتا......اور کہتا کہ اسکی محبوبہ دلائی لامہ کے کھربو والے محل کی پگوڑا قسم کی چھت کے زیر سایہ میرا انتظار کر رہی ہوگی......یہی جگہ انکے وصل کی تھی...... مجھے بھی اسکی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے تھے......کھربو کا نام سنتے ہی اسکا کلو بھر خون بڑھ جاتا تھا......

میری لداخ کی تعیناتی کے دوران پونچھ راجوری کے تین آفیسر اور بھی تعینات تھے...... باقی دو کا ذکر خیر و شر پھر کبھی سہی لیکن مقدم کالو بڑے ہی خاص شخصیت کے مالک تھے...... بڑے متین سنجیدہ قران وسنت کے پابند تھے۔وہ عمدہ قسم کے ہپیوں جیسے جدید قسم کے لباس پہن کر اللہ کی وسیع نعمتوں کا اعلان کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔انکی جبین کی چستی تبتی لڑکیوں کی توجہہ کا مرکز بنی رہتی تھی......انکی لمبی داڑھی پر میں نے کئی نظمیں لکھیں لیکن پکے اہل حدیث ہیں داڑھی کو قینچی نہیں لگاتے تھے......ان دنوں ان کی داڑھی ان کی ناف سے ہوتے ہوئے براستہ خاص گھٹنوں تک چلی جایا کرتی تھی۔اللہ اکبر جب کبھی سیر کے دوران ہوا چلتی تو ان کے بال بید مجنوں کے لمبی شاخوں کی طرح ہلتے اور پھر میرا نعرہ ہشیار باش سنتے ہی وہ اپنا بڑا رومال نکال کر داڑھی کو بڑی بے رحمی سے لپیٹ لیا کرتے......اگر توہین سنت کا ڈر نہ ہوتا تو ضرور ان کے اس عمل کو سکھوں کے ٹھاٹھے یا جالی دار کپڑے سے تشبیہہ دیتا۔خیر وہ اپنے رومال یا مفلر سے اپنی ہوا زدہ ریش کی بدنظمی پر قابو پا لیتے تھے۔اللہ اللہ واقعی داڑھی اللہ کا نور اور مردوں کا زیور ہے......

منشی کالو بلا کے زیرک مزاح گو اور خوش گفتار سخی مزاج ہیں......سخاوت انہیں گٹی

میں پلائی گئی ہے...... یہ صفت انہیں مادری پدری عنایت ہے......اتوار کے علاوہ بھی چھٹیوں کے دوان ہمیں مدعو کرتے اور ہمارا یہ پھٹے ہوئے ڈھول جیسا منہ لقمۂ تر سے بند کرتے رہتے تھے......لیکن ہم بھی خاندانی نٹوں کی طرح بڑے ڈھیٹ تھے کھانا کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور عطار کے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیا کرتے۔اللہ معاف کرے............ان دنوں کتنے ناشکرے تھے ہم۔خیر آگے پیچھے مقدم کالوں کی غیبت ہمارا اولیں فرض تھا......لیکن بھوک لگتے ہی فون کرتے جناب مقدم کالو صاحب کیسے ہیں وہ خدا کے بندے بھی چین بر جبین نہ لاتے......ہمیں ریستوران میں کھانا کھلانا فخر اور اپنا خاندانی شیوہ سمجھتے تھے......کیا وجیہ بزرگ دوست ہیں......ایک دن ہم سیر کے لئے نکلے دو لڑکیوں نے ہاتھوں میں جھاڑو لئے ہوئے تھے......یکا یک انہوں نے جھاڑو اپنی ٹھوڑیوں کے نیچے رکھ کر ہلانے شروع کر دئے......مقدم کالو کا شرم سے میں پسینہ پھوٹتے دیکھا گیا......

واپسی پر انہوں نے قینچی خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنے لمبی اور گھنی شجر نما داڑھی کی شاخ تراشی شروع کی۔انہوں نے داڑھی کا عرض بلد اور طول بلد کم کر کے کندھوں اور چھاتی تک محدود کر دیا۔دعا ہے کہ اللہ انکو ریش گم گشتہ کو پھر سے تاحد نظر کشادہ کرنے کی توفیق دے۔آمین۔



قسط دوئم

# مقدم کالو

(فرضی کہانی)

مقدم کالو میرے بچپن کے قریبی ساتھی بھی ہیں۔لہذا اس دور کی کئی یادیں میرے ذہن کی ریسائیکل بن میں(Recycle Bin)موجود ہیں۔ان میں سے کچھ ایک دوستوں کی خوش طبعی کے لئے پیش کرتا ہوں۔

ایک دفعہ ہم دونوں ایک آبپاشی کے چینل یعنی کوہل پر نہا رہے تھے۔غربت کا عجب دور تھا پاجامے تو ہمیں میسر تھے لیکن کچھے نہیں تھے۔

فیصلہ کیا کہ روز روشن میں ننگے نہاتے وقت ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر لی جائے اس طرح ہم ایک دوسرے کے ستر عورت دیکھنے سے بچ سکتے تھے۔چنانچہ ایسا ہی کیا۔اور آنے جانے والوں سے بھی باخبر تھے اس طرح میں نے اشنان جلدی مکمل کر لیا مقدم کالو کو اپنے گنجان بالوں میں سے صابن نکالتے وقت کافی وقت لگ گیا۔

مجھے شرارت سوجھی میں نے اسکے کپڑے اٹھا کر کوہل سے تھوڑی دور راستے پر رکھ دئے۔اور خود مزید دور بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا...... پھر کیا تھا......مقدم کالو فوجیوں کی طرح کہنیوں اور گھٹنوں کے بل کرالنگ(Crawling)کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

اس نے تگ و دو کے بعد کپڑے اٹھا کر پہنے۔صبر کی داد دیتا ہوں کہ اس نے مجھے کچھ

زیادہ نہیں کہا البتہ یہی کوئی سو،سوا سو گندی گالیاں دیں۔ میں اس کی گالیوں کو میں نے محبت میں برسایے جانے والے پھول سمجھا...... خیر مجھ سے بے وقوفی سرزد ہوئی تھی۔ادھر سے گزرنے والے ایک شخص نے سب کچھ دیکھ لیا تھا اور میری اس احمقانہ حرکت پر مجھے بہت برا بھلا بھی کہا...... مجھے زبردست جھٹکا لگا میں سمجھتا ہوں گالیاں دینا ضروری ہے...... یہ غصے کو فرو کرتی ہیں اور غلط کرنے والے کو سوچنے پر مجبور...... گالیاں دینا اللہ کی سنت ہے......مثلاً کافروں کو ذلیل اور بندر کہا یا پھر عمر قلیل کی تھوڑی سی نافرمانی بدلے ابدی جہنم میں ڈھکیلنے کی دھمکی...... وغیرہ خیر مقدم کالو کو اللہ نے بالوں کی کثرت سے نوازا ہوا ہے......انکی آنکھوں کی پتلیاں، پیروں کے تلوے اور غالباً ایک آدھ اور مقام کو چھوڑ کر ہر جگہ بالوں کے گچھے موجود ہیں۔قدرت کی تقسیم کاری مو پر کئی سوال اٹھتا ہے۔میرے ذھن میں کئی گنجے کھودے اور بغیر بالوں کے لوگ دستک دینے لگتے ہیں۔پر کیا یہ بالوں کا عطیہ باگڑیوں کی بن مانگی ہوئی اولاد کثیر جیسا عطیہ ہے۔بہر کیف

مقدم کالو کے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ اسے عشق نے آن گھیرا۔لڑکپن یا جوانی میں عشق کا ہونا عام بیماری ہے امیر وغریب ہر کسی کے سر پر یہ وبا منڈلاتی ہے......اور اکثر نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے...... بلکہ سچ کہوں تو یہ بیماری کسی بھی عمر میں لگ سکتی ہے۔اور اس سے انسان تو انسان......جنگل کے ریچھ اور بندر بھی مستثنیٰ نہیں۔عشق ومستی میں ڈوبے ہوئے میرے لنگوٹئے دوست مقدم کالو کا ایک تاریخی پریم پتر ابھی تک زمانی دستبرد سے بچا ہوا ہے۔اپنی محبوبہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

’’میرے عشق کی ہینگ اور پھٹکری میری ہونیوالی اولاد کی فیکٹری مجھ مادر زاد عشق میں سخت بھوکے شخص کے لئے دستر خوان پر پروسے گئے لذیذ کھانے جیسی نعمت ہو تم



میں تیرے پیار کا میں بھوکھا تجھ کو سات قسم کی سلادوں اور اتنی ہی چٹنیوں جیسا سلام عرض کرتا ہوں پھولوں کی ٹوکری جیسے بدن والی میری سوہنی میرے بامِ زندگی پر پھیلی ہوئی میٹھی چاندنی میں تیرے عشق میں رانجھا ہوں اور اپنے کانوں میں تیری یادوں کے بالے پہن کر ہر رات کو تیرے گھر کی پیچھے مکی کے کھیتوں میں مچھروں کا شکار ہوتا ہوں۔میری حالتِ زار کو دیکھ اور میرے اوقات پر رحم کر......مجھ کو اپنی ڈیوڑی کے اک طرف تھوکی ہوئی نسوار سمجھ کر کسی توجہہ کا مرکز بنا......‘‘

آپکا ازلی نوکر چاکر مقدم کالو

یہ خط انہوں نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر ایک کنکر سے لپیٹا اور سامنے چھت پر کھڑی محبوبہ کی طرف اچھال دیا......اس نے اچھی طرح پڑھا اور جوابی خط کچھ اس طرح لکھا:

’’میرے ڈیش ڈیش......تمہارا خط پڑھ کر خوشی سے زیادہ غم ہوا۔

میرے آرزومند اور ہونے والے شوہروں کی لمبی فہرست کے آخری نامدار...... میں یہ دعا نہیں کرتی کہ تیرا عشق قران وسنت کی روشنی میں پھلے پھولے مگر پھر بھی امید رکھ۔کیا پتہ ہے میری بدقسمتی کا......اور تیری ہمایوں اقبالی کا ستارہ چمک اٹھے۔پنجاب میں نے پریوں کو بھی جنوں کے قبضے میں دیکھا ہے...... کیا پتہ بدقسمتی سے میں سراپا حسن تجھ سے گوریلے کو ہی مل جاؤں......اور پھر عمر بھر اپنے پولیسئے جوان محبوب کی یاد میں بارش میں دھرے نمک کی ڈلی کی طرح پگھلتی رہوں......‘‘

قدرت کی نیرنگی دیکھئے اور میں اس بات پر گواہ ہوں کہ مقدم کالو کا عشق ادھورا ہی رہا اور ایک دن پتہ چلا کہ اس خوش قسمت مہ پارہ کی شادی اپنے پولیس کے انگوٹھے ٹیک جوان سے ہوگئی۔کیونکہ وہ مقدم کالو کی پریمیکا کے پریمیوں کی لسٹ میں سیریل نمبر ایک پر تھا...... عاشق وہی جسے معشوق قبول کرے باقی سب جھوٹ۔

مقدم کالو کا عشق آج بھی بلیوں بانسوں پر چڑھ کر روتا ہے......

مقدم کالو اس وقت اہم عہدے پر فائز ہیں لداخ میں انہوں نے کئی پراجیکٹ بنائے اور پھر پایۂ تکمیل تک بھی پہنچائے اور آج کل بہت کچھ اور کر رہے ہیں مگر اپنے محبوبہ کی قبر پر کتبہ تک نہیں لگوا سکے فاتحہ درود بھی نہیں پڑھتے کیونکہ ایسا کرنا انکا مسلک اجازت نہیں دیتا......

مقدم کالو صاحب بہت حاضر جواب اور مزاح گو ہیں انکی مزاحیہ باتیں مشہور ہیں......

ایک بار ایک محفل میں لوگ نماز پڑھنے کے لئے صف آرا ہوئے کسی نے مقدم کالو کو تکبیر پڑھنے کو کہا۔ انہوں نے نعوذ باللہ تکبیر انگریزی میں اسطرح پڑھ دی......

''فور ٹائمز اللہ اکبر

ٹو ٹائمز اشھد ان لا الہ اللہ

اینڈ ایکولی محمد الرسول اللہ''

یہ کہنا تھا جماعت والوں نے انہیں توہین تکبیر کی پاداش میں مار پیٹ کر لہولہان کر دیا اللہ معاف کرے انکی مجتہدانہ صلاحیتوں کو کہیں نظر نہ لگ جائے......



قسط سوئم

# مقدم کالو

آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ ہزیمت خوردہ فوج کی طرح جوانی کے قصے بگل بجا بجا کر سناتا ہے یہی حال زندگی کے معرکے ہارے ہوئے صوفی کا بھی ہے زندگی کی مشقت تو جھیل سکا نہیں بیچارہ کنج خلوت میں پرائے ٹکڑے کھا کھا کے خیالی آسمانی سیر کے احوال سناتا رہتا ہے۔ خیر اسکا قصور نہیں ریگستانوں کی جھلستی دھوپ کھانے والے مسافروں نے بھی ان دیکھی عدن کے خواب دیکھے اور سجائے ہیں......

مقدم کالو میری طرح بوڑھے ہیں آجکل ایک طبقے میں مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں میں نے پچھلے پوسٹوں میں اسکی جوانی کے چیدہ چیدہ واقعات اور باتیں پیش کیں۔ کیونکہ انسانی فطرت کے مطابق میں بھی مجبور تھا۔ آج پچھلے پہر جب میں بیدار ہوا تو مقدم کالو کا بچپن میرے ذہن کی کیاریوں میں کھیل کود رہا تھا۔ لہذا اس پوسٹ میں مقدم کالو کی معصوم بیوقوفیوں کے علاوہ کچھ غیر معمولی اور جرات مندانہ واقعات پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے گا۔

بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک دن اسکی گائے جسے وہ قریبی چراگاہ میں چرنے پھرنے کے لئے لے گیا تھا اچانک کہیں گم ہوگئی......مقدم کالو اسے ادھر ڈھونڈنے لگا......آخر

ایک شخص دکھائی دیا اسکے قریب جا کر مقدم کالو نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

جناب آپ نے میری گائے تو نہیں دیکھی۔

آدمی نے پوچھا: بیٹا آپکی گائے کی نشانی کیا ہے؟

مقدم کالو نے کہا: ''گائے کے دو سینگ ہیں اور ایک لمبی دم......وغیرہ''

آدمی نے حاضر جوابی سے کہا ہر گائے ایسی ہی ہوتی ہے اور وہ ہنستا ہوا چلتا بنا......

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔

ہم پانچویں جماعت میں انگریزی کا ''اشو کا قاعدہ'' پہلی بار پڑھنے لگے تھے لیکن مقدم کالو نے ابھی تک دوسری جماعت والا اردو کا نصابی قاعدہ حافظوں کی طرح رٹ کر رکھا تھا۔ وہ اسے آنکھیں اور سانس بند کر کے ''ا'' ''آم'' سے ''ی'' یکہ تک سیکنڈوں میں پڑھ دیتا تھا......

قاعدہ اسطرح تھا

الف......آم، بے......بلی، تے......تکلی، ٹ......ٹٹو، ج......جہاز وغیرہ پڑھتے پڑھتے۔ یکہ تک پہنچ جاتا تھا لیکن بیچ میں۔ وہ جیم...... جہاز پر پہنچتے ہی قاریوں والے سکتے میں چلا جایا کرتا تھا۔ سکتے کی ادائیگی کے بعد اس طرح آگے بڑھتے جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے......

میں نے مقدم کالو سے پوچھا کہ بھائی تم ''ج''،''جہاز'' پر لمبا سکتہ کیوں ادا کرتے ہو؟

مقدم کالو نے بتایا کہ اس جہاز پر اسے دوسری جماعت میں مار پڑی تھی۔

میں نے پوچھا وہ کیسے؟

مقدم کالو بولے:



استاد نے ایک دن مجھ سے پوچھا

دنیا میں سب سے بڑا پرندہ کونسا ہے؟

مقدم کالو کہتے کہ میری شامت آئی میں نے جماعت میں سب سے پہلے ہاتھ اٹھا دیا۔ اور جواب یوں دیا:

''دنیا میں سب سے بڑا پرندہ ہوائی جہاز ہے۔''

استاد نے کہا: یہ کس نے بتایا تمہیں؟

مقدم کالو نے کہا: جناب آپ ہی نے ایک دن بتایا تھا کہ ہر اڑنے والی چیز کو پرندہ کہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی سب بچوں نے تالیاں پیٹ کر داد دی......مزے کی بات یہ تھی کہ تالیاں پیٹنے میں ماسٹر فتح محمد جنہیں ڈگری کالج پونچھ میں وزیٹنگ لیکچرز کے لئے بلایا جاتا تھا وہ خود بھی شامل تھے......

ایک دن مقدم کالو جب تھکا ہارا ہوئے اسکول پہنچا تو...... ماسٹر علی حیدر نے پوچھا

''اوے کالو نیاں پترا۔''

''توں اج راتیں گوڈی کرناں رہیاں''

یعنی او کالو کے بچے۔ تو کیا آج رات کھیتوں میں گوڈی کرتا رہا ہے؟ مطلب یہ تھا تو تھکا ہارا ہوا سا کیوں لگ رہا ہے؟

مقدم کالو نے کہا:

سر آج صبح گیدڑ صاحب ہماری مرغی صاحبہ کو اٹھا لے گیا۔ میں مرغی صاحبہ چھڑانے کے لئے اسکے پیچھے دوڑتا رہا۔ ماسٹر جی اس لئے تھکا ہوا ہوں......

ماسٹر کو ہنستے ہوئے دیکھ کر بچوں کی جماعت بے اختیار ہنسنے لگی......

ماسٹر صاحب نے پوچھا......

''اوانھے نیئے سوٹئے''یعنی

اواندھے کی چھڑی۔ذرابتا

تونے گیدڑ کوصاحب اورمرغی کوصاحبہ کیوں کہا؟

مقدم کالوبولا

جناب آپ ہی نے بولا تھا بڑے کوصاحب اور بڑی کوصاحبہ کہنا چاہئے ۔یہ جواب سنتے ہی آدھی چھٹی کا گھنٹا بج گیا آدھی چھٹی کے وقت بچوں نے مقدم کالوکو ہاتھوں پر اٹھالیا......



قسط چہارم

# مقدم کالو

ہمارے علاقہ پونچھ راجوری میں کئی قسم کے مُلا پائے جاتے ہیں مثلاً ''ریگ ماری'' جو ریگ مار یا ریگ مال کی طرح سوکھی لکڑی پر صفائی کا کام کرتے ہیں۔ کے علاوہ ''ٹھوک ماری''، ''چاند ماری''، ''موجبِ بیماری'' وغیرہ اقسام بھی بکثرت ہیں لیکن ان میں ''چاند ماری'' قسم کے ملا بڑے عجیب ہیں۔ وہ مخالفین پر ایک بار فائر کھولتے ہیں تو پھر ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بند نہیں کرتے......

ایسے ہی ملاؤں کے بارہ میں کہا گیا ھے:

تو گفتی خروسان شاطر بہ جنگ
فتادند درہم بمنقار و چنگ

چونچل مرغوں کی طرح ایک دوسرے کی کلغیاں نوچنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں۔ ان سے مل کر اگلے ہی پل احساس ہوتا ہے کہ انکے یہ حربے ہوشیاری اور شاطر پن فقط اپنے ہی لوگوں پر کارگر ہوتے ہیں۔ دوسری اقوام کے سامنے تو یہ لوگ بھیگی ہوئی بلی کی طرح ہیں۔ انکے پاس ویسے عقلی و منطقی دلائل تو ہوتے ہی نہیں جو دوسری اقوام کے لوگوں کو مطمئن کر سکیں۔ اس لئے انہیں اپنی مسلکی ریگ مار ہمارے جیسے سادہ لوحوں پر

چلا کر تسکین ملتی ہے......انکے زیادہ تر حوالے تارِعنکبوت انکا ردِعمل الزامی در الزامی ہے۔

گرچہ شاطر بود خروس بہ جنگ
چہ زند پیش باز رویین چنگ

مقدم کالو بڑے زیرک نکلے تھے وہ ان سب ملاؤں کو ڈاج کر کے ایک ڈھائی اینٹوں کی مسجد میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ سچ پوچھیے تو مجھے انکی یہ باغیانہ ادا اچھی لگی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے:

منڈی پونچھ کے ریاض الحسن نے مقدم کالو کو دعوت دی کہ تم شیعہ مسلک اختیار کر لو۔

مقدم کالو نے حسبِ عادت پوچھا کیوں اور کس لئے؟

ریاض الحسن نے کہا ہمارے علاقے میں شیعہ صرف کشمیری ہیں آج تک کوئی گوجر بکروال، ملک، راجپوت......شیعہ نہیں بنا......آپ اگر شیعہ بنتے ہو تو اس علاقے کی شیعت کی تاریخ میں ایک روایت قائم ہوگی اور یہ اضافہ چودہ امامینؑ مرحومین کی ارواح کی خوشنودی کا باعث ہوگا اور دنیا اور قیامت میں تمہاری نجات کا سبب بھی وغیرہ۔

مقدم کالو نے کہا: یہ ہو نہیں سکتا مجھ کو اپنی جان عزیز ہے......

کوئی گوجر راجپوت اور جاٹ شیعہ نہیں بن سکتا اگر بن بھی جائے تو محرم کی پہلی ہی تاریخ یا پھر دوسری تاریخ سے آگے زندہ نہیں رہ سکتا۔

ریاض الحسن نے پوچھا وہ کیسے؟

مقدم کالو نے کہا:

ہم لوگ نہایت جذباتی اور سچے ہوتے ہیں۔ ہمیں عام روایتی شیعوں کی طرح دکھاوے کا یا پھر ایک انگلی سے ماتم کرنا نہیں آتا۔ اگر کوئی گوجر راجپوت یا جاٹ شیعہ



بن بھی جاتا ہے تو پھر وہ زبردست طریقے سے ماتم کرے گا یقیناً کوئی پتھر یا تلوار ہی اپنے سر پر مار کر پہلی یا دوسری محرم کو مر جائیگا............

یہ سنکر ریاض الحسن دیر تک ہنستے رہے،، بہرکیف جب کہیں موقع ملتا ہے تو مقدم کالو اپنی ظرافت اور حاضر جوابی کے ذریعہ ان لوگوں کی ظاہرداریوں کا پردہ اٹھاتا رہتا ہے......ہمارے یہاں جب کوئی مرجاتا ہے تو لوگ دکھاوے کے طور پر بہت رسمیں پوری کرتے ہیں مقدم کالو شروع ہی سے ان رسموں کے خلاف ہیں۔

ایک بار انکے پڑوسی گاوں کے ماسٹر اللہ رکھا کا مرغا مرگیا۔ بڑا ہی ہٹا کٹا مرغا تھا جسے ماسٹر صاحب نے بڑے شوق سے پالا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اپنے بچوں سے کہا اس مرغے کو یونہی نہیں پھینکنا......مغرور بلی یا ظالم گیدڑ مفت کا شکار سمجھ کر اسے بری طرح چیر پھاڑ کر کھائے گا۔ یہ مرغا مجھ کو عزیز تھا لہذا انہوں نے باضابطہ قبر جیسا کھڈا بنا کر اس کو پوری رسمی اعزاز سے دفنا دیا......البتہ امام مولوی دین محمد نے نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت نہیں......جب کھڈا تیار ہوا تو ماسٹر صاحب نے اپنے من چاہے مرغے کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر اپنے ہاتھوں سے دفنا دیا...... پھر محلے کے بچوں نے بھی مٹی ڈالنے کی رسم ادا کی۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

اس تدفینی اعزاز کے بارہ میں سن کر مقدم کالو کی رگِ ظرافت پھڑکی اور وہ اگلے ایک منٹ میں ماسٹر کے گھر جا پہنچے۔ ماسٹر صاحب کے گھر کچھ مہمان بھی آئے تھے انکی بیٹھک میں بیٹھنے کے فوراً بعد مقدم کالو نے رسمی فاتحہ خوانی پڑھنا شروع کر دی۔ ان کو فاتحہ پڑھتے ہوئے ماسٹر سمیت سبھی افراد خانہ اور مہمان بھی شریک دعا ہو گئے۔ مقدم کالو نے یہ کام بڑا ہی سرِیَس (Serious) ہو کر کیا......

پہلے چار قل پڑھے پھر کچھ قرآنی سورتیں پھر درود ابراہیمی کے بعد دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ بلند کئے......دعا کچھ یوں تھی

''اے اللہ اس نوجوان متوفی مرغے کا ہر صغیرہ کبیرہ گناہ معاف کر کے اس کو جنت فردوس میں داخل فرما......اے اللہ تو اپنے کرم سے اور نیک لوگوں کے وسیلے سے ماسٹر صاحب کے اس تازہ متوفی مرغے کی بارہ بیوہ مرغیوں کو اسکا نعم البدل عطا فرما۔''

ابھی دعا جاری تھی مرغے مرغیوں کا نام سنتے ہی مہماں کھسک گئے اور ماسٹر صاحب بھی ہنستے ہوئے باہر کھیتوں میں دوڑ گئے البتہ کچھ بچے ادھر ہی بیٹھے کھی کھی کرتے رہے۔

دراصل ان کے پڑوسی ماسٹر جی کو دھوکہ ہوا تھا انہوں نے سوچا تھا کہ یہ دعا انکے والد صاحب مرحوم جو کوئی چھ ماہ پہلے فوت ہوئے تھے کے لئے کی جا رہی ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے مقدم کالو رسموں اور ڈھکوسلوں کے خلاف ہیں۔ یہ اجتہاد انہوں نے بچپن سے جاری رکھا ہے......انکی شادی سے متعلق بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے،

شادی کے دن وہ ماڈرن ڈرس پہن کر باراتیوں کے بیچ میں یوں سج رہے جیسے تاروں میں چودھویں کا چاند ہو............اسی اثنا میں نکاح خوان گواہوں کی ٹیم کے ساتھ وارد ہوا۔

خطبہ وخطاب کے بعد نکاح خواں نے نکاح کا پرچہ جس میں منکوحہ گواہوں حق مہر وغیرہ کی تفصیل بھری ہوئی تھی مقدم کالو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کچھ رسمی الفاظ میں ایجاب وقبول کے کلمات اسطرح دہراتے ہوئے پوچھا۔

''اے نوشہ تو عاقل ہے اور بالغ......تو نے شرع محمدی، دو گواہوں کی گواہی کے ساتھ؛ بعوض ایک لاکھ مہر جس میں سے پچاس ہزار معجّل اور باقی پچاس ہزار غیر معجّل



قرار پایا ہے۔''مسمات تسنیم'' کو اپنے نفس پر واسطے حلالیت وزوجیت تسلیم کیا۔

مقدم کالو خاموش بت بنے تھے مطلب ایجاب قبول نہیں کر رہے تھے۔ محفل میں خسر پسر ہونے لگی۔ نکاح خوان نے پوچھا کیا تم یہ نکاح تسلیم نہیں کرتے۔

مقدم کالو بولے جی میں ''تسلیم'' نہیں بلکہ ''تسنیم'' کرتا ہوں۔

دراصل مقدم کالو کی دولہن کا نام ''تسنیم'' تھا اور اس کو مولوی نکاح خوان کی لمبی تمہید تو یاد نہیں رہی اور اس پر طرہ یہ کہ تسلیم کو وہ کیسے تسلیم کرتے کیوں کہ ''تسلیم'' اس کی سالی تھی اور وہ پہلے ہی شادی شدہ تھی یہ سنتے ہی محفل ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔''

قسط پنجم

# مقدم کالو

مرد کا عورت سے اور عورت کا مرد سے، دلچسپی رکھنا اور ایک دوسرے سے انکا محظوظ ہونا ایک فطری عمل ہے......مقدم کالو بھی جائز طریقوں سے اس خداداد عطیے اور نعمت سے استفادہ کے حق میں ہیں...... وہ کہتے رہتے ہیں کہ بھائی! جنت میں آدم کو سب نعمتیں مہیا تھیں لیکن ان میں تصرف کے باوجود آدم کا دل وہاں نہیں لگتا تھا گویا وہ اپنے پہلو سے دل کو مفقود سمجھتے تھے......خدا نے انکے حال پر رحم کیا۔ اور انکا دل یعنی حوا کو انکے پہلو سے ظاہر کر دیا۔

اگر یہ حالت آدم کی اس وقت تھی جب حوا کا کوئی تصور ہی نہیں تھا......تو آج کیا عالم ہوگا ہمارے دل کا...... جب حوازادیاں ہمارے سامنے عریاں یا نیم عریاں جلوہ گر ہیں...... بھلا انکے حصول یا باریابی کے بغیر ہم کیسے مطمئن رہ سکتے ہیں...... عجب منطق ہے مقدم کالو کی۔ بہر کیف، مقدم کالو عملی زندگی میں جوان عورتوں کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں لیکن حسین لڑکیوں کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسکا کہنا ہے کہ انکا مستقبل زیادہ تابناک اور روشن ہوسکتا ہے بشرطیکہ انکی تربیت کی جائے......ادھیڑ کی عمر عورتوں سے گاہ گاہ وہ بات کر لیتے ہیں لیکن اللہ ہی جانے کیا وجہ ہے کہ بوڑھی عورتیں انہیں



ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ وہ کہتے ہیں بوڑھیوں میں ایک ہی بوڑھی عورت انہیں اچھی لگتی تھیں۔ میں نے پوچھا کیا وہ رابعہ بصری تھیں۔

مقدم کالو نے چیخ کر کہا نہیں جی وہ تو حسن بصری کی محبوبہ تھی......

میں نے بیتابی سے پوچھا پھر کون ہیں وہ؟

مقدم کالو نے کہا: وہ میری دادی صاحبہ تھیں......لیکن قدرت کا کرنا وہ بھی زیادہ عمر نہ پاسکیں یہ کہتے ہی مقدم کالو نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا۔ جب میں نے سہارا دیا تو اس نے کہا: ''دادی کے مرنے کے بعد ہمارے گھر میں کھیر اور حلوے کا وہ التزام نہیں رہا۔ دادی کے مرنے کے ساتھ ساتھ بچپن میں کھیر اور حلوے کا بند ہونا بھی گویا دادی کے غم کا حصہ بن چکا ہے'' دراصل مقدم کالو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے کھیر اور حلوا بوڑھوں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں...... اسطرح مقدم کالو کا بچپن انکی دادی سے بندھا ہوا ہے...... کیونکہ اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی دادی ماں وفات پا چکے ہیں،، لہذا گھر میں اب حلوے کا وہ التزام نہیں رہا۔ خیر،

میں بات کر رہا تھا مقدم کالو کی نظر عنایت کا جو اکثر صنفِ نازک پر ہی مرتکز رہتی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک گاڑی میں بیٹھے ہوئے سفر کر رہے تھے ایک بس اسٹاپ پر سے ایک نوجوان عورت اور ایک بڑھیا سوار ہوئیں......کوئی سیٹ خالی نہیں تھی......مقدم کالو نے اس حسین وجمیل نوجواں عورت کی طرف اشارہ کیا جب وہ متوجہ ہوئی تو مقدم کالو نے اپنے بالوں سے بھرے ہوئے دست و بازو آگے بڑھائے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسکے ناخنوں کے سوا انگلیوں پر ہتھیلی پر بال ہی بال نظر آئے۔؟

خیر مقدم کالو نے جسارت کر کے عورت کو بازو سے پکڑ کر سیٹ پر بٹھانا چاہا لیکن عورت نے اپنی بوڑھی ماں یا ساس جو بھی تھی اسے بٹھا دیا مقدم کالو کو سیٹ دان کرنے کا سخت غم ہوا۔

انہوں نے آہ بھر کر اس مہ پارہ سے مخاطب ہو کر کہا: یہ سیٹ تو میں نے آپکو ثواب کی نیت سے دی تھی افسوس میرا ثواب ضایع ہو گیا۔اور میری نیکی اکارت گئی۔

اس نوجوان عورت نے تمسخرانہ مسکراہٹ بھرتے ہوئے مقدم کالو سے کہا......

میں سمجھتی ہوں مجھ سے زیادہ مستحق اس سیٹ کی یہ میری بوڑھی ماں ہے......آپکو اس کے بڑھاپے پہ تو رحم آیا نہیں اور میری جوانی پر آ گیا......

یہ سنکر مقدم کالو نے سر نیچے جھکا لیا......میں نے آہستہ سے کہا جناب سفر لمبا ہے وہ سامنے دیکھو گاڑی کے بونٹ کے اوپر لکھا ہوا: ''سرینگر سے جموں بارہ گھنٹے کا راستہ ہے'' ابھی ایک ہی گھنٹے کا راستہ طے ہوا تھا......اگلے گیارہ گھنٹے مقدم کالو گاڑی کے ڈنڈوں سے چمگادڑ کی طرح جھوجھتا رہے۔ خیر مجھے کیا تھا دوستی اپنی جگہ سیٹ اپنی جگہ......میں مزے سے اپنے سیٹ پر سویا رہا راستے میں ہم کھانا کھانے کے لئے جب بٹوٹ میں گاڑی سے اترے تو مقدم کالو نے مجھ سے شکایت کی...... یار مجھے یہ سخاوتیں ہمیشہ ہی بہت مہنگی پڑتی ہیں...... یہ کہ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کے چھالے دکھائے جو ڈنڈوں کو پکڑ پکڑ کر انکی بے موہتھیلیوں پر پڑ گئے تھے......خیر میں نے توجہ نہیں دی اس لئے کہ پرائی پیڑ میری بلا جانے......اور پھر یہ تو خوشی کے سودا بازی تھی...... بہر کیف، مقدم کالو ہمارے ہر دلعزیز دوست ہیں کسی کے بھی گھر بے تکلف آتے جاتے رہتے ہیں انہیں محرموں کا سا سلوک دیا جاتا ہے ایک دن مقدم کالو اپنے پرانے دوست اور ہمدم کے نئی نویلی بہو کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے۔ بیچ بیچ میں انکے دوست کی زیتون بی بی نامی بیوی چائے پانی فروٹ وغیرہ رکھنے کے بہانے انکی باتیں بھی سنتی تھی......ایک مرتبہ زیتون بی بی نے پوچھ ہی لیا......

مقدم کالو جی: کیسی لگی ہماری بہو؟

مقدم کالو نے کہا جی وہی تو جانچ رہا ہوں۔آدمی کو جانچنے میں کچھ وقت لگتا



ہے......بہر حال آپکی بہو ایک گلہ کر رہی ہے۔

زیتوں بی بی نے ہڑ بڑا کر پوچھا کیا گلہ کرتی ہے یہ۔

مقدم جی نے کہا۔

میں آپکی بہو سے کہا تھا کہ آپ بڑی خوش قسمت ہو کہ آپ اس گھر میں آئے ہو۔لیکن اسنے تو عجیب جواب دیا ہے۔

زیتون بی بی بولی وہ کیا؟

مقدم جی نے کہا: یہ کہتی ہے کہ ''خوش قسمت میں نہیں بلکہ زیتون اماں ہے'' کیونکہ شادی کے آٹھویں دن ہی انکی ساس مر گئی تھی لیکن میری شادی ہوئے دو مہینے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک زیتون اماں زندہ ہے......

یہ سن کر زیتون بی بی ہنسنے لگی اور اسکی بہو بھی دراصل یہ مقدم کالو کی حاضر جوابی تھی۔

مقدم کالو کا مجھ پر بھی ایک احسان ہے......وہ یہ ایک بار مجھے دوسری شادی کا خیال آیا کیونکہ ایک مالدار عورت سے میری رسم و راہ تھی......موقع فراہمی انسان کو چور بنا دیتی ہے......میں اس عورت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا کرتا تھا......تنہائی میں عورت اور مرد باہم دودھ اور شکر کی طرح ایک دوسرے میں حل ہو کر پر کیف ذائقے میں بدل جاتے ہیں۔لیکن یہ ذائقہ میرے حق میں زہر ہلاہل بننے والا تھا کیونکہ میں دو بچوں کا باپ تھا اور میری بیوی بھی کسی سے کم نہیں ہے اس میں کوئی عیب نہیں تھا،،البتہ میں چار بیویوں والے پرمٹ کا غلط فائدہ اٹھانا چاہتا تھا......لیکن میرے مشفق دوست مقدم کالو نے مجھے اس غلط کام سے بچا لیا......پہلی اچھی بھلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا یقیناً فحش کاری نہیں تو بھی غیر سنجیدہ کام ہے۔مقدم کالو نے ایک لطیفہ سنایا جو میری زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ میری بیوی صاحبہ کی داغ بیل کے لئے آبِ حیات بخش کے چھینٹوں جیسا ثابت ہوا......

قسط ششم

# مقدم کالو

لطیفے کی بات چلی ہے۔لطیفہ ہے کیا؟ میں سمجھتا ہوں ۔ ہر آدمی ایک لطیفہ ہے جسے خدا نے سماج کو سنایا ہے......اگر کوئی سمجھے تو لطیفے لطیفے کہئے یا آدمی، آدمی میں فرق ہے۔کوئی ہنسنے ہنسانے والا اور کوئی رونے رلانے والا......لطیفوں کی دنیا میں محبت کی طرح درمیان کی راہ نہیں ہوتی۔یعنی لطیفہ یا تو طنز ہوتا ہے یا مزاح......

فی الحال میں انکی لطافت اور کثافت کی بحث میں نہیں پڑتا۔یہ ہمت کی بات ہے کہ کہیں کوئی صاف دل،خوش مزاج کھلکھلا کر ہنستا ہنساتا ہے اور کہیں کسی اندر ہی اندر کڑھنے والے کو خندہ زیرلب کی توفیق بھی نہیں ملتی۔طنز ومزاح آزاد گھرانوں اور سماجوں میں ذہین اشخاص کے زیرسایہ پرورش پاتا ہے۔فکری آزادی اس کے لئے پہلی شرط ہے۔ظاہر ہے جب کوئی جھکڑ شخص یا ہتھیار بند دہشت گرد سامنے کھڑا ہوتو کس کی مجال کے وہ لطیفہ سنا سکے......لہذا یہ عیاں ہوتا ہے کہ طنز ومزاح کے لئے ادب کی دوسری اصناف یا پھر فنون کی طرح ایک مخصوص آزاد ماحول کی ضرورت ہے......

بہرکیف،

میں اس لطیفے کی طرف آتا ہوں جو نامور بزلہ سنج ،لطیفہ گو، ماہر نفسیات اور تجربہ کار



دوست مقدم کالو نے مجھے سنایا۔مقدم کالو کی نصیحت کے بدولت ہی میں نے دوسری شادی کا ارادہ ترک کیا تھا۔

مقدم کالو کہتے ہیں جس طرح جنت ودوزخ جسکا پیدا ہونا اور اس میں جانا، وقوعِ قیامت کے بعد ہی ممکن ہے۔لیکن بزرگوں نے برزخ کے احوال پہلے ہی مثالی صورت میں پہلے ہی سن اور دیکھ لئے یا وہ یہ دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں......

کسی اللہ والے نے دیکھا کہ جنت کا وقوع ہو چکا ہے اور......

دو آدمی جنت کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں......

پہلے آدمی نے جب دروازہ کھٹکھٹایا......تو جنتی دروازے کے چھوٹے سے روزن سے جھانکتے ہوئے ایک بھوری مونچھوں والے گورے نوری فرشتے نے پوچھا:

کیا تم شادی شدہ ہو......؟

پہلے آدمی نے کہا: (میعادی بخار کے مریض جیسی پست آواز میں )۔جی ہاں میں نے شادی کی ہے۔

فرشتے نے اپنا ریکارڈ چیک کیا اور کہا ٹھیک ہے۔تو نے مسلسل ستر سال بیوی کے ہاتھوں مثالی تکلیف اٹھائی ہے اور وہ عمر قید بھی قید بامشقت جیسی تھی......لہذا تم اندر آسکتے ہو......یہ کہتے ہی اسکے لئے جنتی دروازہ کھول دیا گیا اور یہ زن مرید کہئے یا چاکرِ زن کہئے،افتاں وخیزاں جنت میں داخل ہوگیا......

دوسرے آدمی کی باری آئی تو فرشتے نے کہا کہ تم نے شادی کی ہے؟

دوسرے آدمی نے استحاق جتاتے ہوئے فخر اور دعویٰ سے کہا:

جی ہاں ایک نہیں بلکہ۔(ضعف کی وجہہ سے آواز گلے میں ہی اٹک جاتی ہے تھوک نگل کر پھر حوصلہ کیا اور بولا...... ) دو شادیاں کی ہیں اور............(مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔)

فرشتے نے کڑک آواز سے کہا خاموش......

تم یہاں سے جا سکتے ہو؟

دوسرا آدمی: (مرے ہوئے لہجے میں بولا) میں نے تو دوگنی سزا پائی ہے لہذا میں بھی جنت کا مستحق ہوں......

فرشتے نے کہا: عمل کی کمی یا بیشی الگ مسئلہ ہے۔ لیکن تم بیوقوف ہو...... جنت میں بیوقوفوں کے لئے کوئی جگہ نہیں......

خیر یہ قصہ، کہانی تھی یا بزرگ کا مشاہدہ...... میں اس قبیل کی تمام ترہیب وترغیب والی داستانوں سے سبق حاصل کرنے کا قائل ہوں۔ مقدم کالو کی بات کا مجھ پر کچھ اثر ہوا۔ امید ہے اپنے مقررہ وقت پر مجھے اور میرے دوست مقدم کالو کو ضرور جنت ملے گی......

میں نے مقدم کالو سے مزید پوچھا۔

یار میں ذرا منطقی قسم کا آدمی ہوں...... ایک سے زیادہ عورتوں سے عیش کرنا چاہتا ہوں...... کیونکہ ایک ہی نعمت پر اکتفا کرنا اضطراری صورت میں غرباء وفقراء کے لئے تو روا ہوسکتا ہے لیکن صاحبِ دولت اور اہل نصاب کے لئے تو لذت پسندی مباح ہے......حتیٰ کہ ہماری تاریخ امراء وحکماء وسلاطین بلکہ اولیاء وغیرہ کا محور لذت پسندی ہی رہا۔ اکثر اہل ثروت نے اس جنسی نعمت سے جائز طور پر لطف کثیر وحظ وافر حاصل کیا ہے......تو پھر میں کیوں پیچھے رہوں......

مقدم کالو نے ایک مضحکہ خیز قہقہہ لگایا۔

ذرا پھر سے کہو کیا چاہتے ہو؟

میں نے اسی لڑکی کا نام لیا کہ اگر اسکے ورثاء بیاہ کے لئے راضی نہ ہوئے تو میں اس کو بھی زبردستی اٹھا لے جاؤں گا۔



مقدم کالو نے کہا: تمہاری کوئی بہن ہے؟

میں یہ جملہ سن کر سہم سا گیا......

میں نے کہا جی ایک نہیں بلکہ پانچ ہیں۔

اچھا تو تم بتاؤ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ اگر کوئی اور شادی شدہ آدمی دست درازی یا زبردستی کرنے کا ارادہ کرے تو تم کیا کرو گے؟ مجھے غصہ آ گیا...... کیونکہ میرا تعلق بھی اس قوم سے ہے جو سوچتی کم ہے اور جذباتی زیادہ ہے۔ جن کو اللہ نے دل تو دیا ہے لیکن دماغ نہیں دیا......

میرے دل میں غصے سے شیطانی خیال آیا کہ مقدم کالو کی داڑھی کا ہر بال نوچ کر ان سے پاپوش بنالوں......لیکن مجھے اسکی دیرینہ صحبت کے علاوہ اسکی احسان مندیاں یاد تھیں اور ویسے کسی حد تک درست کہہ رہا تھا......سوچنے پر میرا غصہ فرو ہو گیا۔

پھر میرا خیال دو شادیوں والے پڑوسی کی طرف گیا...... جو اکثر ہمارے گھر آ کر روتا دھوتا رہتا تھا............ ایک بار بچپن میں، میں نے اپنے والد سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا۔ بیٹا ہم دونوں ''پیٹی بھائی'' ہیں۔ اسکی دو بیویاں ہیں جب یہ پہلی بیوی سے کھانا مانگتا ہے تو وہ کہتی ہے'' جا دوسری کے پاس کھا......پھر جب دوسری کے پاس جاتا ہے تو وہ کہتی جا پہلی کے پاس کھا'' ...... بیچارہ کو اکثر میری طرح بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ یہ کہہ کر میرے والد نے مجھے گلے سے لگالیا......اور میرے والد نے میرے کانوں میں کہا...... بیٹا میری نصیحت ہے'' بیٹا زندگی میں کبھی دو شادیاں نہ کرنا'' لیکن مجھے والد کی نصیحت اور فضیحت دونوں یاد تھیں......پھر،

مجھے بچپن کے واقعات یاد آئے جب وہ پڑوسی اور میرا والد دو غمزدوں کی طرح ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہتے تھے۔ ویسے بھی دکھیا کی بات دکھیا ہی سنتا ہے...... کیونکہ میرے والد نے بھی دو شادیاں کی ہوئی تھیں۔ خیر،

بیوی ایک ہی کافی

دوسری سے معافی......

مقدم کالو کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ایک دن وہ بازار سے اپنی بیوی کے لئے ہیئر اینڈ کیئر ( Hare and Care) لانے گئے۔

بازار میں یار بیلی مل گئے گپ شپ ہوئی۔ دوستوں کی محفل میں گھر کی فرمایشیں کسے یاد رہتی ہے......لہذا وہ شام کو خالی ہاتھ لوٹے۔

ڈیوڑھی پر بیوی کو دیکھ کر اپنے سر پر ہاتھ مارا......اور کہہ اٹھے

''میرے سر میں گوبر بھرا ہوا ہے مجھے یاد ہی نہیں رہا......''

بیوی کہنے لگی: ''نہیں جی نہیں غلط کہہ رہے ہو......اگر تمہارے دماغ میں گوبر بھرا ہوتا تو وہ زرخیز ہوتا۔ میں سمجھتی ہوں اس میں تو بھوسا بھرا ہوا......بھوسا۔''

یہ سنتے ہی مقدم کالو کو اپنے بھلکڑ پن کا بھرپور احساس ہوا......



قسط ہفتم

# مقدم کالو

اس میں شک نہیں کہ انسانی حافظہ ایک خداداد نعمت ہے۔ لیکن جس آدمی کی قوتِ حافظہ بہت زیادہ ہو اور وہ چیزیں بھولنے کا عادی نہ ہو تو یقیناً اس آدمی کا فرسٹیٹ یا پاگل ہو جانا یقینی ہے......انسانی ذہن کمپیوٹر کی میمری جیسا ہے اس کا کچھ حصہ واش ایبل یعنی شستنی ہے اور کچھ حصہ بنیادی پروگریمز کی طرح ان واش ایبل یعنی غیر شستنی بھی ہے......میں سوچتا ہوں کمپیوٹر انسانی دماغ کی بعض صفتوں کی ایک ترقی کردہ یا پیشرفتہ صورت ہے......لیکن پورے یا مکمل انسانی دماغ کا کوئی جواب پیدا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ خیر میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نسیان وسہو کی صفات انسانی دماغ کی حفظان صحت کے ضروری عمل ہے۔ ورنہ یہ لوڈڈ ہیمریج یعنی دماغی رگوں کے پھٹنے سے ''سیلان دم'' کا شکار ہو جاتا ہے......بہرصورت ایسی صورت میں انسانی دماغ کام کا نہیں رہتا ہے...... بقول شخصے

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اوپر کی گئی بحث کے پیش نظر مقدم کالو جیسے ذہین وفطین شخص کا بھلکڑ ہونا ضروری اور واجبی ہے......مقدم کالو جتنا ذہین وفطین ہے اتنا ہی بھلکڑ بھی ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ کہ انکی بیوی تسنیم اختر نے اپنے امپورٹڈ پرس (Imported Purse) سے پانچ سو روپے کے دو نئے نئے نوٹ نکال کر مقدم کالو کو دیے اور کہا ان روپوں سے کڑھائی والا پشمینے کا بینگنی سوٹ بازار سے لیتے آنا۔ کیونکہ اس دن تسنیم اپنی سہیلیوں کے ساتھ مصروف تھی۔ مزید انکی بیوی نے کہا یہ سوٹ اسے شام کو پارلر پر جاتے وقت اپنی من پسند درزن کو سلائی کے لئے دینا ہے۔ کیونکہ پچھلے سال کے سوٹ بھر بھرے سے ہو چکے ہیں۔

مقدم کالو بازار چلے گئے۔ خدا کے فضل سے ہمارا شہر میٹروپالیٹن ہے...... خدا نے اسے آوارہ بیلوں، کھلے پھرنے والے سانڈوں اور فیشن پسند عورتوں کے لئے گویا جنت بنا دیا ہے...... یہاں نہ تو کشمیر جیسی باز پرسی ہے نہ ہی حجاب کی پابندی...... نہ ہی کسی داڑھی میجر ملا کا ڈر...... اور نہ پولیس سمیت شوہروں کی سرزنش...... کشمیر سے دربار کے آتے ہی یہاں رونق بڑھ جاتی ہے۔ خیر،

یہاں مردوں کے دفتر یا دکانوں پر جاتے ہی بعض عورتیں بن سنور کر بازار چلی جاتی ہیں...... انکے اس شوق کا فائدہ اٹھانے والے افراد کی بھی کمی نہیں۔ ہمارے مقدم کالو بھی کبھی کبھی بر سر بازار شوق نظارہ فرما لیتے ہیں......

اس دن مقدم کالو بازار تو چلے گئے لیکن طرح طرح کے دلفریب نظاروں میں کھوئے رہے۔ ادھر شہر جموں کے ''ویو'' مال میں حیدر فلم شو بھی چل رہا تھا انہوں نے بیچ میں وہ بھی دیکھ لیا۔ واپسی پر وہ پرانی منڈی بازار گئے جو دلی کے مینا بازار جیسی کئی گلیوں پر مشتمل، دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور خالصتاً زنانہ کپڑوں کا بازار ہے...... اس بازار میں بارہ مہینے خوبصورت مجمعے لگے رہتے ہیں عورتوں کی بھیڑ باڑ رہتی ہے...... بہر حال مقدم کالو نے کسی دکان سے عمدہ سا پشمینے کا گرم سوٹ بھی خرید لیا...... گھوم پھر کر جب گھر پہنچے تو انکی اہلیہ صاحبہ نے پوچھا وہ سوٹ کہاں ہے؟



مقدم کالو نے کہا خریدا تو تھا مگر......

تسنیم اختر: نے کہا...... یہی ناں اسے لانا بھول گئے۔

مقدم کالو: کھسیاتے ہوئے بولے...... جی جی......

تسنیم اختر: اچھا جلدی بتاؤ دکان اور گلی کون سی ہے؟ میں خود ہی جا کر لے آتی ہوں۔

مقدم کالو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اجی مجھے نہ تو وہ دکان یاد رہی ہے نہ ہی وہ گلی۔

تسنیم اختر: (صبر کی ترشی و تلخی برداشت کرتے ہوئے کہتی ہے) اچھا دکاندار کا چہرہ تو یاد ہوگا چلو ڈھونڈتے ہیں۔

مقدم کالو نے اپنی گنجان اور لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

اگر دکان دار کا چہرہ یاد رہا ہوتا تو میں خود ہی جا کر نہ لے آتا...... تم بھی عجیب عورت ہو۔ سوال پر سوال کئے جا رہی ہو...... میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو...... خیر میاں بیوی میں جم کر لڑائی ہوئی آخر مسئلہ اس وقت ٹھنڈا ہو گیا جب مقدم کالو نے کہا: یہ لو میرا اے ٹی ایم ایک کے بدلے دو سوٹ خرید لینا مگر میری جان چھوڑو...... خیر

دوسرے دن کا واقعہ ہے کہ مقدم کالو علی الصبح چھٹی کو غنیمت جان کر تفریح کے لئے بازار گھومنے نکل گئے...... انکا یہ دستور انجینئرنگ کالج کے زمانے سے تھا...... کہ جس دن کلاس نہیں ہوا کرتی تھی وہ نئے سوٹ بوٹ سے آراستہ پیراستہ ہو کر کشمیر یونیورسٹی جو انکے کالج کے متصل ہی تھی چلے جایا کرتے تھے۔ اللہ معاف کرے بعض دفعہ انہیں زنانہ کالجوں کے آگے پیچھے بھی گھومتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ خیر،

ٹھیک اسی دن یہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ انکی بیوی تسنیم صاحبہ بھی بازار میں گرم پشمینے کا سوٹ خریدنے گئی تھی مقدم کالو کو رات کی بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ تو 10 بجے ہی ٹھرک مارنے کے لئے باہر نکل جاتے تھے مقدم کالو نے دیکھا کہ ایک گلی میں ایک خوبصورت عورت دکان پر بیٹھی ہوئی ہے اور دکاندار اپنے تین چار سیلز بوائز

(Sales boys) کے ساتھ کپڑوں کے تھان الٹ پلٹ کرا سید کھا رہا ہے۔ بڑی دکان تھی۔ اس دکاندار نے کوئی تیس چالیس سوٹ کھول کر اس عورت کے سامنے رکھ دئے تھے...... تسنیم نے گلی سے جھانکتے ہوئے اپنے مرد کو دکان کے باہر دیکھ لیا تھا......

یہ مرد بھی عجیب آوارہ گرد کی طرح تھا جو اسی گلی میں ادھرا ودھر اڑ رہا تھا۔ ہر بار اسی دکان سے سلامی دیتا ہوا نکلتا پھر تھوڑ آگے سے پلٹ آتا تھا دل ہی دل میں سوچتا کتنی پٹاخہ عورت ہے......

جب وہ عورت کپڑے خرید چکی تو دیکھا کہ مقدم کالو وہیں پہ دکان کے ایک طرف نظریں جھکائے بت بنے کھڑے تھے......

تسنیم نے چیخ کر کہا (چیخ کے وقت انسان کی آواز بدل جاتی ہے۔) کیوں جی یہاں کس لئے کھڑے ہو؟ مقدم کالو ڈر کر کہنے لگے:

''بہن جی آپکو کہیں دیکھا ہے''

...... یہ سنتے ہی تسنیم ذرا دھیمے لہجے میں بولی اچھا تو یہ بات ہے...... مقدم کالو نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا (اب تو وہ اسے پہچان چکے تھے...... دل میں سوچا بھانڈا پھوٹ چکا ہے...... تدبر سے کام لینا پڑے گا......)

مقدم کالو فلمی انداز میں زور زور سے ہنسے لگے......

تسنیم اختر نے کہا...... مجھے سب پتہ لگ گیا ہے۔ کہ تم چھٹی کے دن کیا کرتے ہو؟

مقدم کالو نے فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہا:

سنو تو سہی میری جان!

بیوی نے کہا کہو کیا کہنا باقی رہ گیا ہے؟

مقدم کالو نے کہا: دراصل میں آپکو سرپرائز (Surprise) دے رہا تھا۔ یہ سنکر بیوی نے آسانی سے یقین کر لیا...... بلکہ اسکا پارا ایک دم نیچے آ گیا...... کیونکہ وہ بیچاری



عام اور سیدھی سادہ مزاج کی عورت تھی اور مقدم کالو نہایت ہی طباع و ذہین۔ سچ تو یہ ہے ذہانت ہر وقت کام آ ہی جاتی ہے......

ان کے بھلکڑ پن کے متعلق کئی واقعات ہیں مثلاً ایک دفعہ وہ صبح سویرے، منہ اندھیرے سیر سپاٹے کو نکلے تو کافی دور چلے گئے انکی یہ عادت مجھے اچھی لگتی ہے کہ وہ بلا ناغہ روزانہ سیر کرتے ہیں۔

ایک دن جب وہ سیر سے واپس لوٹ رہے تھے تو پولیس پٹرولنگ پارٹی کے پولیس انسپکٹر حلیم راتھر جو مقدم کالو کے دوست تھے نے انہیں سڑک پر مع عملہ گشت کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ مقدم کالو پر ہنسنے لگے۔ مقدم کالو نے پوچھا: یار ہنسنے کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہئے؟

حلیم راتھر بولے،

یار میری ہنسی کی وجہ میرے سامنے، زنانہ شلوار پہن کر مجسمہ وار کھڑی ہے......

یہ سنتے ہی مقدم کالو کے حواس اڑ گئے سنبھل کر نیچے دیکھا تو وہ بھی قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ دراصل ان کی کی شلوار کا تبادلہ ہو چکا تھا...... کہنے لگے برا ہو بجلی والوں کا...... آج صبح بجلی کا کرٹیلمنٹ (Curtailment) تھا یہ شلوار تو میری نہیں...... سوری،

مقدم کالو نے وہ زنانہ شلوار اتار کر لپیٹ لی اور اپنے پٹھانی سوٹ کی قمیص کو اپنے لمبے سکھی کچھے میں ڈالکر...... ریس لگائی اور سیدھے اپنے گھر پہنچ گئے...... اپنی شلوار ڈھونڈ کر پہنی اور اس زنانہ شلوار کو اپنی جگہ پر رکھ دیا اور کان سے کان تک خبر نہیں ہونے دی۔ انکی اہلیہ ابھی تک سو رہی تھیں خیر۔

لیکن پولیس والے کسی کے سگے نہیں ہوتے، پولیس والوں نے یہ خبر شہر میں پھیلا دی......

قسط ہشتم

# مقدم کالو

آجکل سوشل میڈیا اور انٹرنٹ کے زمانے میں خبریں بہت جلد یہاں وہاں پھیل جاتی ہے یہ پیشہ چھچھورے صحافیوں نے سنبھالا ہوا ہے مقدم کالو کی شلوار کا واقعہ صحافیوں نے ہی اچھالا تھا۔انہیں یہ خبر انسپکٹر حلیم راتھر کے دو پیادوں نے دی تھی۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ کام حلیم راتھر کے ایما پر ہوا تھا۔بہر حال مقدم کالو کی شلوار کی خبر پورے بازار میں،نومبر کے مہینے میں لگی ہوئی جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔شعر

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

اسی شام مقدم کالو حلیم راتھر کی حویلی پر چلے گئے۔باتوں باتوں میں مقدم کالو نے حلیم راتھر کو بتایا۔کہ اسکی بتائی ہوئی رشوت اور حرام خوری سے متعلق بیشمار باتیں ہیں جو اسکے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ویسے کی ویسی محفوظ ہیں......اب تم سے بدلا لیا جائیگا۔کان کا بدلا کان،ناک کا بدلا ناک...... بلکہ تم سے دلی خراشوں کا بھی حساب لیا جائیگا۔حلیم راتھر نے کہا۔

یار ٹھیک ہے......کوئی گپ ہی سناؤ......رحیم راتھر نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا......



رشوت یا مال حرام تو تم بھی کھاتے ہو...... یہ بتاو اس راز مخفی اور طریقہ کار کیا ہے؟

مقدم کالو جو ابھی تک تھوڑے دکھی تھے نے جلے بھنے ہوئے کہا۔حرام مال تو میرے محکمہ میں لیا جاتا ہے لیکن اسکا راز تجھ جیسے حرامی کو نہیں بتاوں گا......یہ سن کر حلیم راتھر ہنسنے لگا......ادھر مقدم کالو غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا۔اب وہ بہکے ہوئے شرابیوں کی طرح گپیں ہانکنے میں مصروف ہو گئے......

حلیم راتھر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا......

یار میں تو قتل کیس کی ایف آئی آر بھی مفت نہیں درج کرتا......اگر کوئی عصمت دریدہ لڑکی اپنی روئیداد لے کر آتی ہے تو اس سے بھی میں وہ مزیدار سوال کرتا ہوں کہ بات مت پوچھ......مزہ آجاتا ہے۔شہر کا ایک ڈاکٹر تو اپنا لنگوٹیا یار ہے......

مقدم کالو نے کہا اور بھی بہت سے باتیں چھپاتے کیوں ہو؟ مقدم کالو نے کہا: کیا تمہاری اور اس فرض ناشناس ڈاکٹر کی مضروبی رپورٹوں، پوسٹ مارٹم رپورٹوں اسقاط حمل کے کیسوں میں ساجھے داری نہیں ہے۔؟ اسکے علاوہ منشیات سمگلنگ، غیر قانونی ٹریفکنگ وغیرہ۔کیا تمہاری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے معتبر ذرائع نہیں؟

حلیم راتھر نے سر ہلایا اور وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

اسکے بعد مقدم کالو نے کہا......یار ویسے تو میں نمازی ہوں حج بھی کیا ہے لیکن اس کم بخت رشوت کے بغیر چارہ نہیں۔مفت کی قاضی کو بھی حلال......کوئی بھی محکمہ رشوت سے پاک نہیں......کیسے وعظ اور کونسی نصیحتیں۔رشوت لینا دینا کلچر بن چکی ہے۔

مقدم کالو نے چائے کی سپ بھرتے ہوئے کہا...... چوریاں میرے محکمہ میں بھی ہوتی ہیں لیکن چھاتے چرانے والے انجینئر کی بات پر مجھے شرم آرہی ہے۔اس نے پورے محکمہ کی ناک کٹوا دی......اسکو چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے میں مزہ آتا ہے۔ ایک دن بارش ہوئی تھی اسی انجینئر نے اپنے بڑے چھاتے میں کلرکوں کے فولڈنگ

چھاتے ڈال کر چرا لئے تھے......لیکن کلرکوں نے دفتر کے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو اشارہ کر کے اس چور انجینئر کو خوب رسوا کیا...... یہ سنکر حلیم راتھر خوب ہنسا......

حلیم راتھر نے کہا یار ہم اس قسم کی گھٹیا چوریاں نہیں کرتے۔ بلکہ ہم داڑے سے رشوت لیتے ہیں......یہی نہیں بلکہ رشوت کو ہم شیر مادر کی طرح حلال سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا حصہ اوپر بھی دینا پڑتا ہے......

مقدم کالو نے کہا ہمارے محکمے کا بھی یہی حال ہے......

اسکے بعد حلیم راتھر بولا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں ان دنوں سیٹی تھانے میں منشی محرر تھا......

بازار میں گری بیچنے والا ''گری لے لو......گری گری'' کہتا ہوا جا رہا تھا۔غنڈوں نے گری کے دو تین ٹکڑے اٹھا لئے۔گری فروش نے جب پیسے مانگے تو غنڈوں نے اسے مار پیٹ دیا......گری فروش پر شامت آئی تھانے رپٹ لکھوانے چلا......تھانے کے گیٹ پر موجود سنتری نے بھی گری کے دو تین ٹکڑے اٹھا کر کھا لئے۔جب وہ آگے بڑھا تو تھانے کے احاطہ میں موجود پولیس کے جوانوں نے اسکی تھالی کو مال غنیمت سمجھا اور پل بھر میں صفایا کر دیا۔حلیم راتھر کا کہنا ہے کہ جب وہ گری فروش میرے پاس پہنچا تو اسکی تھالی خالی تھی......

میں نے اس گری فروش سے کہا

یار میرا حصہ کہاں ہے؟ گری فروش رپٹ لکھوانا بھول گیا......اسکے بعد اس نے زوردار قہقہہ لگایا......

گری فروش نے کہا۔ جناب گھر سے جا کر ابھی لاتا ہوں یہ کہہ کر وہ چلا گیا......اور اسکے بعد کبھی نہیں لوٹا......

پھر حلیم راتھر نے مقدم کالو سے کہا......اس واقعہ کو دس سال ہو گئے ہیں۔یار اسکے



بعد میں نے بہت رشوت بھی لی۔حرام کا مال بھی کمایا لیکن اس......کچی گری بھی کھائی لیکن سالے اس گری فروش کا ابھی بھی انتظار ہے......اسکے بعد اس نے اس گری فروش کی آوزاز دہرائی......''گری گری گرررررررررری آ''

اسکے بعد وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے......اسی اثنا میں مقدم کالو کو بیوی کا فون آ گیا......

# مقدم کالو

عورتیں مردوں پر شک کرتی ہیں اور مرد عورتوں پر......اسکی نفسیاتی وجہ نا آسودہ خواہشیں اور غیر تکمیل شدہ جنسی تعلقات کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتی ہے۔کیونکہ شک زیادہ تر جوان یا ادھیڑ مرد عورتیں ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ بوڑھے مرد عورتیں کبھی ایک دوسرے پر شک نہیں کرتے...... مجھے حال ہی مقدم کالو جو میرا ہم عمر دوست ہے کے واقعہ سے بھی اس بات کی تائید ہوئی ہے......

مقدم کالو کی بیوی تسنیم اختر کو شروع سے ہی اپنے شوہر پر شک رہتا تھا جب وہ گھر سے باہر جایا کرتا تھا وہ مسلسل اسے فون کرتی رہتی تھی......ایک دن تو اس نے یہ حیرت ناک ڈرامہ کر دکھایا تھا......

اتوار کو جب مقدم کالو بن سنور کر گھر سے نکلا۔تو اسکی بیوی نسیم اختر کو شک ہوا۔اور ساتھ ہی اس کو ایک ترکیب سوجھی......اس نے فٹافٹ سے پڑوسن سے لایا ہوا برقعہ پہنا کیونکہ انکے گھر میں اپنا برقعہ تھا ہی نہیں اور نہ وہ پہنتی تھی۔اسکے علاوہ اس نے مستعار پازیبیں بھی پہنیں جو عام طور مہذب عورتیں نہیں پہنتی لیکن آج وہ پازیبی چھنکا کے کی آواز سے کسی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہتی تھی......

تسنیم اختر نے اس دن ڈرس بھی غیر روایتی شوخ رنگ کا پہنا تھا......خیر وہ برقعہ



پوش......ایک اندازے کے مطابق زنانہ کالج کے متصل نرسنگ ہاسٹل کے سامنے چوک میں برقعہ پہن کر کھڑی ہوگئی۔اس نے بائیں ہاتھ پر آج پہلی بار مہندی والے سے بڑے بڑے مہندی کے پھول بھی بنوا لیے تھے۔دائیں ہاتھ میں ریشمی رومال تھا اور برقعے کا نقاب جعلی دار تھا جس سے انکی بلند ناک آدھی۔شمشیر تابدار کی طرح دکھائی دے رہی تھی اور غلافی نرگسی آنکھیں پوری......

ادھر مقدم کالو بھی گھومتا ہوا نرسنگ ہاسٹل کی طرف آنکلا...... یہ برقعہ پوش اپنے ہاتھ کو ریشمی رومال سے جھاڑ رہی تھی۔لہذا مقدم کالو نے اس حسینہ کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا......اس میں شک نہیں کہ مقدم کالو نے اسی چوک پر سے بہت سی نرسوں سے عشق کیا تھا لیکن آج انکی توجہ کا مرکز کوئی اور نہیں تھا بلکہ یہاں کھڑی یہ برقعہ پوش عورت تھی......

مقدم کالو نے برقعہ پوش عورت کے سامنے لگی ریڑھی پر آ کے پان والے کو کہا: بھیا ذرا میٹھی پان دینا......ادھر برقعہ پوش عورت نے پہلے تو اپنے خوبصورت ہاتھ دکھائے......جنکی ہتھیلیوں کے اوپر نیچے مہندی کے ڈیزائن خوب سج رہے تھے......
مقدم کالو نے سوچا اتنے حسین ہاتھوں والی عورت اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

دل میں خیال آیا اسکے ہاتھ کی روٹی تو کسی قسمت والے کو ملتی ہوگی۔یہ سوچ کر اس نے آہ بھی کھینچی......اس سوچ کے آتے ہی وہ برقعہ پوش عورت جو بظاہر کسی کا انتظار کر رہی تھی کے وہ اور قریب چلا گیا......

اب تو مقدم کالو کو اسکی جھیل سی آنکھیں اور بھی صاف دکھائی دے رہی تھی......گویا وہ ان میں دن کے وقت چوراستے پر اپنی قسمت کا ستارا ڈھونڈ رہا تھا......مقدم کالو کو برقعہ پوش عورت جو اسے دو تین میٹر کی دوری پر کھڑی تھی سچ مچ بہت ہی خوبصورت

لگی......چند منٹوں میں اس نے اپنے دل ہی دل میں اس کے وصل کے ہزار خواب دیکھے......اس نے اگلے چند لمحوں میں تین میٹر کا فاصلہ آسانی سے طے کر لیا اور جب وہ اسکے میٹر بھر کی دوری پر تھا......عورت نے اسکی طرف پیٹھ کر کے ایک چٹ پر کچھ لکھ کر مقدم کالو کو پیش کیا......مقدم کالو نے پڑھا......

''یہاں بات نہیں ہو سکتی......اس چٹ کے پیچھے اپنا موبائل نمبر لکھ دو......اگر اللہ نے چاہا تو شام کو آپ سے تفصیلی بات ہو گی اور ملاقات بھی۔''

مقدم کالو نے اپنے مخصوص پارکر قلم سے اسی چٹ کے پیچھے اپنا موبائل نمبر لکھا بلکہ دستخط بھی کر دیا۔

اس سے پہلے کے مزید بات کرتے برقعہ پوش نے ہاتھ لہرایا......یعنی الوداع کیا اور ایک ٹیکسی روکی......مقدم کالو نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کی باری کھولی اور برقعہ پوش عورت کو ٹیکسی میں بٹھا دیا......اسکے بعد اس نے ہزار حسرت بھری بھوکھی اور للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے ٹیکسی میں دیکھا۔لیکن وہ برقعہ پوش جا چکی تھی......

شام کے وقت مقدم کالو گھر لوٹے تو انہوں نے ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہی اپنی بیوی تسنیم کو آواز دی......اسے لاڈ پیار سے وہ بیگم کہتے تھے......

بیگم بیگم......کی آواز سنتے ہی انکی بیوی باہر آئیں لیکن آج انکا گورا چہرا آگ کی طرح سرخ تھا......غصے سے کہا بولو......جلدی جلدی،

مقدم کالو نے کہا۔آپکو پہلوان کی ہٹی والی جلیبیاں پسند ہیں۔ میں گرما گرم پیکنگ لایا ہوں......انہیں کھولو اور گرما گرم کھا لو......

اور سنو تمہارا چہرا لال کیوں ہے؟

اور ایک ہاتھ تم نے پیٹھ پیچھے کیوں رکھا ہوا ہے؟

بیوی سے رہا نہ گیا۔بلاسٹ (Blast) ہو گیا۔برا بھلا کہنے کے بعد اس نے



کہا......

سنا ہے آج دن بھر تم کسی برقعہ پوش عورت سے عشق لڑاتے رہے ہو۔

مقدم کالو......نہیں واللہ ایسی کوئی بات نہیں۔

کسی نے جھوٹ کہا ہے......

یہ سنتے ہی بیوی نے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ موبائل فون نمبر والی چٹ مقدم کالو کے ہاتھ پر رکھ دی۔اور اسنے کہا یہ دستخط آپ ہی کا ہے ناں......

چٹ کو دیکھتے ہی مقدم کالو کے ہاتھ سے جلیبیوں والی پیکنگ نیچے گر گئی اور اسکی بیوی نے وہ حشر کیا جو ایک جوان عورت اپنے مرد یا شوہر کی بیوفائی پر کرتی ہے......وہ بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ مار رہی تھی اور مقدم کالو الٹے قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے جونہی ڈیوڑھی پر پہنچے تو بیوی نے ڈھکیل کر انہیں باہر کر دیا اور ڈیوڑی بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی......مقدم کالو اندھیرے میں دوست کے گھر کا راستہ ٹٹول رہے تھے۔

قسط دہم

# مقدم کالو

آدمی پر جب کوئی مصیبت یا افتاد پڑتی ہے تو اس کا دھیان اپنے پرانے کرم فرماؤں، یاروں اور مددگاروں کی طرف جاتا ہے......اور اکثر دوست ایسے موقعوں پر ساتھ نہیں دیتے۔ ویسے بھی داناؤں نے کہا ہے کہ لوگوں کی پہچان لین دین اور معاملات یا واسطہ پڑے جانے پر ہوتی ہے، اہل وعیال کی پہچان تنگی وفقر میں اور دوستوں کی پہچان مصیبت اور مشکل کی گھڑی میں......

مقدم کالو گھر سے نکالے جانے پر یہی سوچتے ہوئے تاریک گلیوں میں جا رہے تھے۔انہیں ابھی تک یہ پتہ نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے......؟

گلی کے موڑ پر انہوں نے اپنے سر کے جھاڑی جیسے گنجان بالوں میں انگلیاں ڈال کر خوب مروڑے۔ دردسر میں جب کچھ آفاقہ ہوا تو اس نے سوچا کہ حلیم راٹھر کے گھر جانا ٹھیک نہیں......اسی طرح ایک دوامیر دوستوں کے گھر رات گزارنے کا خیال بھی مناسب نہیں لگا......آخرکار انہوں نے شہر سے تھوڑا باہر ماسٹر کریم بخش کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ماسٹر کریم بخش اچھے آدمی تھے۔ویسے تو ماسٹر کریم بخش نے کئی بار انہیں دعوت دی تھی۔مقدم کالو نے سوچا......اسی کے گھر جانے کا یہ بہتر موقع ہے......لہذا وہ رات کے وقت ویران گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے نکلے......انہوں نے دیکھا کہ



رات کے وقت گلی کوچوں میں آوارہ کتے بھی وردی پوشوں کی طرح ادھر ادھر گشت کرتے رہتے ہیں...... بلکہ ایک جگہ تو انہوں نے مقدم کالو کو مشتبہ سمجھ کر حملہ بھی کر دیا تھا لیکن قسمت اچھی کہ ایک چوکیدار نے اچانک نمودار ہوکر فراٹے والی سیٹی بجائی اور پھر لانبا جیسا ڈنڈا گھما کر آوارہ کتوں کو بھگا دیا۔

کتے بھی اتنے اڑیل نہیں تھے۔ویسے تو رات کے وقت یہ کتے بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں......اسکے علاوہ مقدم کالو کو کچھ جیب کتروں اور غنڈوں کا بھی ڈر تھا......جو رات کے وقت بھولے بھٹکے اور وضع دار لوگوں کو لوٹ مار کا نشانہ بنا لیتے ہیں......اسی ڈر سے مقدم کالو نے ایک آٹو رکشا والے سے کہا مجھے جلدی فلاں جگہ چھوڑ دو......لیکن آٹو والے نے عذر کیا......

جناب بیچ میں کچی سڑک پڑتی ہے ہے اور ویران علاقہ............اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا......اگرچہ سفر تین چار کلومیٹر ہی لیکن کئی جوکھموں اور خطرات سے بھرا ہوا تھا......

جب آدمی پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو آدمی کے ارادے اور بھی مضبوط ہو جاتے ہیں اور اسکا دماغ زیادہ کام کرنے لگتا ہے......مقدم کالو نے چوراچکوں اور آوارہ کتوں کی پرواہ کئے بغیر گھنٹے بھر میں یہ سفر طے کر لیا......اور اسطرح انہوں نے ماسٹر کریم بخش کے گھر پہنچ کر راحت کی سانس لی۔

ماسٹر کریم بخش شہر کے قریبی گاؤں میں رہتا تھا گاؤں کا دستور یہ ہوتا ہے کہ لوگ شام پڑتے ہی کھانا کھا کر سوجاتے ہیں۔گاؤں میں لوگوں کے پاس ریفریجریٹرز بھی نہیں ہوتے۔چولھا جلا کر ضرورت کے مطابق ہی تازہ کھانا بنا کر کھالیا جاتا ہے......وافر کھانے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا......

مقدم کالو...... ماسٹر کریم بخش نے جس کمرے میں بٹھایا تھا۔اسی کے ساتھ

والے کمرے ماسٹر کریم بخش کی اہلیہ بستر پر پڑی تھیں......ماسٹر کریم بخش نے اسے
جا کر کہا......ارے بی اٹھو اٹھو میرا دوست مہمان آیا ہے......

رات کے سناٹے میں اور بیچ والے کواڑ کی درزوں سے دوسرے کمرے سے آواز
بھی سنائی دے رہی تھی۔ مقدم کالو نے ویسے بھی اپنے بالوں والے لمبے لمبے دونوں
کان انکی باتوں پر دھرے ہوئے تھے......

ماسٹر کی بیوی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

اجی پہلی بات یہ ہے کہ رات کے دس بجے کونسا وقت ہوا مہمان کے آنے کا؟

مجھے تو آپکا یہ دوست ہی کچھ گڑ بڑ لگتا ہے......

ماسٹر نے کہا بڑا ہی اشراف ہے تم خواہ مخواہ شک کر رہی ہو۔

ماسٹر کی بیوی نے کہا......اس وقت مجھ سے چولہا جلا کر کھانا نہیں بنایا جا سکتا...... یہ
سوچتے ہی اسے غصہ آ گیا......اٹھ کر درز سے نظر ماری......اور مڑ کر وہ اپنے شوہر یعنی
ماسٹر جی سے کہنے لگی......

اس کمینے کے بچے نے اگر ہمارے گھر آنا تھا تو مناسب وقت پر آتا......چلو جو کچھ
ہم نے کھایا اسکے مرنے بھی لگا دیتی۔

اسکو کیا سوجھی کہ یہ ریچھ والے بالوں سمیت......اس وقت...... رات گئے ادھر
آن حاضر ہوا۔

میری مانو تو اسکو کھانے کی مت پوچھو۔ ایسے ہی سلا دو......ایک رات میں یہ بھوک
سے مرنیوالا نہیں......

(مقدم کالو نے یہ باتیں کواڑ کی درز سے کان لگا کر سن لیں تھیں)

ماسٹر جی کھنکارتے ہوئے مقدم کالو کے کمرے میں آئے اور پوچھا جناب آپ
کھانا کھا کے آئے ہیں تو آرام فرمائیں......



مقدم کالو نے کہا۔ جی میں رات کے گیارہ ساڑھے بجے کھانا کھاتا ہوں...... جو
ہو سکے آپ آرام سے بنائیں۔ رات کا کھانا صحت کے لئے از حد ضروری ہے......

ماسٹر بیوی کے پاس ممیاتا ہوا پہنچا۔ دیکھئے۔ دیکھئے۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتا
ہے......اس لئے کھانا بنانا ہی پڑے گا......اور یہ بھی سنا دیا کہ وہ گیارہ ساڑھے گیارہ
بجے کھانا کھاتے ہیں......

ماسٹر کی بیوی بولی...... بڑا ہی ڈھیٹ آدمی ہے یہ تمہارا مہمان......اب اس وقت
کیا بناؤں جو روکھی سوکھی بن سکے گی کھلا دینا اسکو

ماسٹر نے کہا۔ نہیں میری عزت کا سوال ہے

ڈربے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا...... کچھ تو کرنا ہی پڑے گا......

ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ مرغی نہیں ذبح کرنے دوں گی اسکے چھوٹے چھوٹے چوزے
ہیں۔

اور بولی جاو جا کر پڑوسی سے مرغا لاؤ......

ماسٹر جی مقدم کالو کے پاس آیا اور کہنے لگا،

جناب آپ ایسے وقت پر آئے کہ روکھا سوکھا کھانا ہی بن پائیگا......لہذا میں سخت
شرمندہ ہوں۔

(مقدم کالو انکی خفیہ باتیں پہلے ہی سن چکے تھے بوجھ کر......)

مقدم کالو نے کہا...... ماسٹر صاحب آپکی شرمندگی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی
آپ جو چاہیں اچھا سا کھانا بنائیں......میں دیر سے کھا لوں گا ویسے بھی تو میرا کھانے
کا وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہے۔

ماسٹر صاحب کی یہ ترکیب بے کار گئی......اب انہیں مرغے کا بند و بست کرنا
پڑا......

پڑوسی کے گھر گئے اس کی بیوی نے ماسٹر جی سے کہا۔ ہماری بارہ مرغیوں میں ایک ہی جوان مرغا ہے۔

......کھی کھی۔ ہنستے ہوئے اس نے کہا آپ ہی کچھ انصاف کریں ناں...... ماسٹر جی نے کہا...... بہن جی ایک مرغی ہی دیدو...... پڑوسی کی بیوی نے کہا...... ہائے توبہ یہ سب مرغیاں انڈے دیتی ہیں۔ آپکو پتہ ہی ہے میرا نکما اور نکھٹو گھر والا گھر میں پڑا پڑا دن رات حقہ پیتا رہتا ہے۔ وہ آپکی طرح ماسٹر تو ہے نہیں کہ اسے مفت کی تنخواہ آتی رہے۔

میرا گزارہ انہی مرغیوں پر ہے......

الغرض ماسٹر صاحب نے رات کے گیارہ بجے اپنی چھوٹے چوزوں کی ماں اور اکلوتی مرغی کے گلے پر اللہ اکبر کہہ کر بے رحم چھری پھیری...... مرغی کی آخری۔ کڑاں کڑاں۔ سنکر مقدم کالو سنسناں اور نیم تاریک مہمان خانے میں مسکرائے۔ مرغی کا تصور آتے ہی پیٹ میں چوہوں نے اور تیزی سے ناچنا شروع کر دیا تھا۔

اگلی پونے گھنٹے میں مرغی کے شوربہ سے کھانا تناول فرما کر وہ سکون کی نیند سے سو گئے...... دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کتنا مزیدار کھانا تھا مگر...... ماسٹر کی کمینی بیوی بھی کیا یار رکھے گی؟



گیارہویں قسط

# مقدم کالو

گھر سے باہر سچ مچ یہ رات بڑی اذیت ناک تھی۔ مقدم کالو کو پہلے پہر کچھ دیر کے لئے آنکھ لگی تھی۔ لیکن جلد ہی وہ گھر سے نکالے جانے کا واقعہ اس کے دماغ میں کسی سونامی کی طرح آ گیا تھا...... اس نے بار بار اٹھ کر پانی پیا۔ جونہی وہ اپنے پہلو کو بستر پر رکھتا تو ماسٹر اللہ بخش کی بیوی کی نازیبا باتیں اسے سرخ چیونٹیوں کی طرح کاٹنے لگتی تھی...... مقدم کالو جب زیادہ پریشان ہوتا تو میزبان ماسٹر کریم کی مزبوح مرغی کا واقعہ یاد کر کے تھوڑی دیر مسکراتا۔ مگر یہ لجنندہ دیرپا نہ تھا بلکہ وہ جلد ہی اسکے چہرے کی اداسیوں میں غائب ہو جاتا...... مقدم کالو کی رات کسی بیمار کی رات سے لمبی تھی اور عاشق کی جدائی کی رات سے بھی بدتر............ بہرحال

مقدم کالو سمجھتا تھا کہ وہ ان رسموں اور رواجوں والے سماج میں ایک مجاہد کی طرح اپنے مخصوص طرز عمل سے جہاد کر رہا ہے...... اپنے گھریلو مسائل کو بھلا کر اس کے دل میں خیال آیا...... کتنی ریاکار دنیا ہے...... لوگ کوئی بھی کام خلوص سے نہیں کرتے......

اس نے دل ہی دل میں کہا...... ماسٹر کریم بخش اگرچہ اسکا دوست ہے اسکو تکلف کی کیا ضرورت تھی اور اسکو چاہئے تھا کہ مجھے بغیر پوچھے یا بغیر ڈرامہ رچائے روکھا سوکھا جو بھی میسر تھا مجھے کھلا دیتا...... جب کبھی رات کو اسے مرغی کا ذائقہ دار ڈکار آتا تو

اسکے ساتھ ہی ماسٹر کریم بخش کی بیوی کی تعفن آمیز باتوں کے ابکار بھی آنے لگتے تھے............لیکن مقدم کالو نے ماسٹر اور اسکی بیوی کو اچھی عبرت سکھائی تھی۔ وہ بھی کیا یاد رکھیں گے......

مقدم کالو کو رہ رہ کر اپنی پرانی مزاحیہ باتیں یاد آ رہی تھیں......اور انہیں یادوں سے اس رات کی تلخی میں کمی آئی تھی ورنہ............خیر

مقدم کالو کو ایک اور واقعہ یاد آیا جب اسنے اپنے گھر، بالنفس نفیس خود، میاں اسحاق نامی شخص کے آگے کھانا رکھا اور صرف ایک بار کہا۔ میاں جی۔ کھانا کھائیں۔

اگرچہ میاں اسحاق کی مرضی کھانا کھانے کی تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ مقدم کالو اور انکی بیوی دست بندھے اسے تاکید سے آٹھ دس بار کہیں اور وہ کھانا کھائے۔ لیکن مقدم کالو ان رسموں کے خلاف تھے۔ وہ تو مہمان کو صرف ایک بار ہی کہتے تھے پھر میزبان کھائے نہ کھائے اس کی مرضی ہوتی۔ بہرحال وہ خود اسکے سامنے دسترخوان پر بیٹھتے اور جم کر کھانے کی صفائی کی......مقدم کالو کی یہ عادت شریف مجھی بھی اچھی نہیں لگتی تھی......کون اتنا بے شرم ہو جو پرائے دسترخوان پر بار بار خود ہاتھ بڑھا کر مختلف پکوانوں کا ذائقہ چکھے......خیر

اس دن میاں اسحاق مقدم کالو کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے تھے کیونکہ انہوں نے ایک بار کہہ کر کھانا کھانا شروع کر دیا تھا......دل ہی دل میں میاں اسحاق نے سوچا تھا...... اگر ظالم مقدم کالو نے ایکبار اور کہا ہوتا تو ''میں ضرور کھانا کھا لیتا۔'' مگر نہ یہ ہوا اور نہ وہ......مقدم کالو کھانا کھا چکے تھے اور میاں اسحاق کھانے کی ابھی تمہید باندھ رہے تھے......نتیجہ یہ نکلا کے ایک بے تکلف کہیئے یا بے مروت آدمی کے دسترخوان سے باتکلف اور شریف آدمی کو بھوکا ہی جانا پڑا تھا...... بعد ازاں۔

میاں اسحاق نے پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹا کہ مقدم کالو بڑا کمینہ آدمی ہے۔ اس



نے مجھے اپنے گھر بلایا اور مجھے کھانے کی تاکید کیئے بغیر ہی خود میرے سامنے جم کر کھانا کھایا۔

جب یہ بات مقدم کالو تک پہنچی تو انہوں نے تین دن کی چھٹی رکھی اور میاں اسحاق کی تحصیل میں جا پہنچے۔ میاں اسحاق کو قصبے میں ڈھونڈ نکالا اور اس سے کہا......میاں میں آپکے گھر ہی چلوں گا۔ میاں اسحاق کو کبھی تو میاں کالو کی کی گئی غیبت یاد آ رہی تھی اور کبھی انکے گھر والا ناخوردہ کھانا۔ بہرحال

میاں اسحاق نے بن بلائے مہمان کو ساتھ لے لیا......میٹ مارکیٹ سے گزرتے وقت مقدم کالو نے میاں اسحاق سے کہا......بائیک روکو......

میاں نے بائیک روکی مقدم کالو نے کہا کچھ میٹ اور مرغا لے لو۔ گھر سے پھر واپس آنا پڑے گا تمہیں......

میاں اسحاق......نے بائیک روکا اور کچھ میٹ اور مرغا لے لئے۔

میاں اسحاق نے سوچا کہ پیسے مقدم کالو دے گا کیونکہ میٹ کا آرڈر انہوں نے ہی بائیک رکوا کر دیا تھا......لیکن

مقدم کالو نے کہا۔ بھائی میں آپکا مہمان ہوں......الغرض اسی طرح......مقدم کالو تین دن مسلسل میاں اسحاق کے گھر رکے رہے......اور مزے کی بات یہ ہے کی تین دن اپنی مرضی سے مینو بدل بدل کر میاں اسحاق سے کھانا بنواتے اور کھاتے بھی رہے۔

تیسرے دن جب میاں اسحاق سے ضبط نہ رہ سکا تو انہوں نے کہا جناب مہمان خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تین دن مسلسل آپکی خدمت کا موقعہ ملا۔

مقدم کالو خاموش تھے پھر میاں اسحاق نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور سوال

کیا۔ جناب آج میرے گھر پر قیام کا پروگرام ہے یا پھر یہاں سے کوچ کا......

مقدم کالو خاموش تھے...... پھر میاں اسحاق نے اپنا سوال دہرایا......

جناب آج میرے گھر پر قیام کا پرواگرام ہے یا پھر یہاں سے پھر کوچ کا؟

مقدم کالو نے کہا......جی قیام کا ارداہ ہے......

یہ سنتے ہی میاں اسحاق نے کہا......

جناب مجھے بیوی کو چیک اپ کے لئے کشمیر لے جانا ہے۔ آپ شوق سے میرے گھر قیام کر سکتے ہیں یہ رہی میرے گھر کی چابیاں......لیکن مجھے تو آج بہر حال کوچ کرنا ہے......

مقدم کالو ہنسنے لگے یار میاں......چلو

آپکی مجبوری کے مطابق میں اپنا پروگرام بدلتا ہوں......لیکن ایک۔ وعدہ کرو......

میاں اسحاق نے کیا وعدہ کروں؟

مقدم کالو نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا......

میاں اسحاق......آج کے بعد تکلف نہیں کرو گے اور میری غیبت بھی نہیں......

میاں اسحاق یہ سنتے ہی ندامت کے پسینے میں ڈوب گئے......

یہی سوچتے سوچتے صبح ہو چکی تھی......مقدم کالو نے بغیر چائے ناشتے کے ماسٹر کریم بخش سے اجازت لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں......



بارہویں قسط

# مقدم کالو

بے شک میاں بیوی کی لڑائی بعض دفعہ بھیانک صورت اختیار کر جاتی ہے لیکن عام طور پر بالآخر یہ دودھ ملائی ہوتی ہے......لڑائی کی صورت میں عام طور پر عورت کو گنہگار اور نافرمان ثابت کر کے دبا دیا جاتا ہے......اور ہمارے سماج میں مرد تو شروع سے ہی عورت پر افسر ہے۔ لیکن کہیں کہیں عورتیں مردوں پر غالب آ جاتی ہیں......مقدم کالو پر اسکی بیوی غالب تھی وہ اس لئے کہ مقدم کالو سے اکثر کوئی غلطی یا حق تلفی ہو جایا کرتی تھی۔ خیر

مقدم کالو کو گھر سے باہر نکالنے کے بعد اسکی بیوی کو بھی بہت برا محسوس ہو رہا تھا......وہ رات بھر مقدم کالو کی عافیت کے لئے متفکر رہی...... بلکہ اس نے مقدم کالو کے بخیر گھر لوٹنے کے لئے منت بھی مانی تھی۔

ہمارے سماج میں عورتوں کا خدا پر یقین انکی سماجی زبوں حالی اور پریشاں حالی سے جڑا ہوا ہے۔ مرد کی افسر شاہی والے سماج میں اسکی آخری امید اللہ، خدا، یزدان، گاڈ یا بھگوان ہوتا ہے......سماج کے فیلک سٹرکچر (Phallic Structure) کی یہ عطا ہے۔

اس کی یہ منت پوری ہوئی۔ دوسرے دن مقدم کالو نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ہوٹل میں فریش ہو کر ناشتہ کیا......ناشتہ کرتے وقت انہیں گھر کی مولی اور آلو والی پروٹھیاں اور دہی یاد آ رہا تھا۔ خیر فارغ ہو کر دفتر کو چلے گئے......دن بھر پچھلی

شام والا غصہ ملازموں پر جھاڑ پھٹک کی شکل میں نکالتے رہے......

چار بجے دفتر سے واپسی پر مقدم کالو نے سوچا کہ وہ قریبی ہمسائے ماسٹر اللہ راکھا کے گھر ہی چلا جائے تا کہ ان کے اور انکی بیوی کے درمیان صلح وصفائی کی کوئی راہ نکل آئے۔

ادھر مقدم کالو کی بیوی اگر چہ انکی بخیر واپسی کے لئے منتیں مان چکی تھی لیکن ابھی تک اسکا غصہ پورا ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

مقدم کالو اپنی بیوی کے مزاج کا پورا علم رکھتے تھے وہ کچھ دن اور گھر سے باہر گزارنا چاہتے تھے تا کہ بیوی کو انکی عدم موجودگی اور گھر بار چلانے کی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔

دوسرے دن جب مغرب کے وقت تک مقدم کالو اپنے گھر نہ پہنچے تو انکی بیوی کو سخت فکر ہوئی......چھت پر کھیل کود رہے بچوں نے بتایا کہ انکے پاپا یعنی مقدم کالو پڑوس کے میراثیوں کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دئے ہیں۔

میراثیوں، بھانڈوں، مسلیوں اور چماروں کو ہمارے سماج میں برابر کا رتبہ تو دور بلکہ عام مسلمان، انہیں ملیچھ اور شودر سمجھتے ہیں......

میں نے دیکھا ہے مسلکی دیواروں میں قید مسلمان لوگ دوسرے مسلک والے سے رشتہ تعلق تو دور اسکے گھر پانی بھی نہیں پیتے۔ یہاں تو میراثیوں یا مسلیوں کا گھر تھا۔کوئی کیسے آتا جاتا۔

یہ سنکر مقدم کالو کی بیوی تسنیم کے جسم میں آگ لگی گئی کیونکہ میراثیوں، مسلیوں، چماروں اور بھانڈوں کی عورتوں کے بارہ میں اسکے وچار درست نہیں تھے لیکن ماجرا کچھ اور تھا......

مقدم کالو مغرب کے وقت جب گھر لوٹ رہے تھے انہیں مسلیوں کے گھر سے



باسمتی چاولوں کے پکنے کی خوشبو آئی تھی یہی نہیں بلکہ تازہ ذبح کئے گئے مرغے کے پر بھی ادھر ادھر راستے پر اڑ رہے تھے......

مقدم کالو میراثیوں کے گھر کے سامنے ایک پل کے لئے رکے وہ اپنی تیز قوت شامہ کی بدولت نہایت لذیذ کھانے کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے......دراصل میراثیوں کو اس دن کسی فیاض امیر نے ڈھول پیٹنے پر ڈبل اجرت دے دی تھی۔ میراثیوں نے سوچا زندگی میں ایکبار، ایک دن تو اچھا کھانا کھا لیتے ہیں......لہذا کھانا تیار کیا گیا تھا...... جسے دیکھ کر میراثیوں کے بچوں کے منہ میں سے رال ٹپک رہی تھی لیکن اچانک مقدم کالو انکے تنگ کمرے میں......پنجابی بڑی پگڑی والے پیروں کی طرح یہ کہتے ہوئے داخل ہو گئے۔

''السلام علیکم۔کی حال ہے مریدو''

ادھر میراثیوں کے گھر کوئی پیر سید تو آتا نہیں تھا انہیں زندگی میں پہلی بار یہ الفاظ سن کر بہت خوشی ہوئی......

''السلام علیکم کی حال ہے مریدو''

وہ اپنے دل میں مقدم کالو کے یہ جملے دھرا دھرا کر جھکی ہوئی نگاہوں سے استقبال کر رہے تھے۔

گویا سب باآواز بلند دل کہہ رہے تھے

اھلاً وسھلاً مرحبا......

یعنی آئے آئے ہمارے سر ماتھے پہ آپکے قدم۔اے ہمارے سید و مولا۔ ہماری مائیں اور باپ آپ پر قربان ہوں۔

خیر مقدم کالو موقع کا فائدہ اٹھانے میں یکتائے زمانہ اور پہنچے ہوئے شخص تھے......مسکراتے ہوئے براجمان ہو گئے۔

میراثیوں نے کھانا پروسا اللہ اللہ
اور پیر پیغمبروں کی روح ایصال وثواب کرتے ہوئے مقدم کالو کے آگے رکھا۔
مقدم کالو کھاتے کھاتے کہہ رہے تھے۔

اور لاؤ

اور لاؤ......

میراثی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے یہ کیسا ہمارا پیر بنا......راکھس ہے دیو......جن یا بھوت......کیا ہے؟ کچھ سمجھ نہ آیا۔

میراثیوں کے بچے خالی ہوتے پتیلے دیکھ کر کھیل کود کے لئے باہر نکل گئے۔

مقدم کالو نے بھات اور سالن سب کچھ اندر کر دیا......

اب مقدم کالو رسمی پیروں کی طرح ڈکار مار کر تھالی چاٹنے میں مشغول تھے یہ دیکھ کر ایک میراثی کو ہنسی نکل گئی......اس نے دل میں سوچا: ''پتیلے خالی کر کے بھی اسکی بھوک نہیں مٹی......اب ہماری تھالی کو بھی چاٹ چاٹ کر سوراخ کر دے گا......''

مقدم کالو نے ہنستے ہوئے میراثی سے کہا......

تھالی چاٹنا سنت ہے اور یہ عمل گویا مدینہ کی گلیوں می جھاڑو پھیرنے جیسا ہے......

یہ سنتے ہی میراثی نے سالن والا خالی پتیلا بھی لا کر انکے آگے رکھ دیا......

حضور پورا مکہ شریف بھی حاضر ہے...... یہاں بھی جھاڑو لگادو......خیر مقدم کالو کو ٹس سے مس نہیں ہوئی......

کھانے کھانے کے بعد مقدم کالو سیدھے اپنے پڑوسی ماسٹر اللہ راکھا کے گھر پہنچے۔
اور وہاں سے اپنی بیوی کی جھلک دیکھ کر خوش ہو رہے تھے......اور انکی بیوی نے جب یہ محسوس کیا تو اس نے پیٹھ پھیر دی......



تیرہویں قسط

# مقدم کالو

ہم اپنی شریک حیات کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اچھی طرح، پرسکون زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہمارا معاشرہ ہی کچھ ایسا ہے کہ جسکی بیوی نہیں، لوگ اسکے ایمان کو ادھورا اور مذہب کو شک کی نیت سے دیکھتے ہیں۔ شادی شدہ زندگی میں اگر میاں بیوی کے رشتہ میں کوئی رخنہ یا دراڑ پڑ جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے......ایسی حالت میں ہر ایسے شوہر اور جو ہرو کے لئے زمین و آسمان کی وسعتیں گویا سمٹ کر محدود ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کسی دوسرے آزاد خیال معاشرے میں اس قسم کی نوبت نہ آئے۔ بہر حال۔

گھر سے بیوی کے ہاتھوں نکالے جانے کے بعد......مقدم کالو کا دو ہی دنوں میں ناک دم میں آ چکا تھا۔

قریبی دوستوں کے گھر رہنا بھی اسکے لئے باعث اذیت و موجب کوفت تھا......ماسٹر اللہ راکھا جس کے گھر مقدم کالو قیام پذیر تھا اگر چہ وہ بیوی سے ظاہری طور چند قدموں کی دوری پر تھا مگر ذہنی طور پر وہ بہت دور ہو چکا تھا۔ اپنے گھر میں تو وہ زور زبردستی سے بھی جا سکتا تھا۔ اپنی بیوی پر حاکمیت جما سکتا تھا۔ مگر اسکا ضمیر اسکو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا...... کیونکہ وہ اپنی بیوی کی نظر میں گر چکا تھا......اسکو تو

پہلے اپنی اہمیت وحیثیت منوانی تھی......اور اپنا مقام بحال کرنا تھا۔ یہ کام وہ کم سے کم وقت میں کرنا چاہتا تھا......پچھلے دو دنوں کے حربوں سے وہ کسی قدر اپنی بیوی کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب بھی ہوا ہے......

اسے خیال آیا کہ داماد کے اگر کرتوت اچھے ہوں تو سسرال والے بھی اسکے حمایتی ہوتے ہیں۔ ایسے داماد کو کل وقتی داماد کہا جاتا ہے۔ ورنہ اس دامادی رشتہ کا تو رنگ رو شادی کے دوسرے دن ہی اڑ جاتا ہے......

اسے خیال آیا کہ سسرال والوں کو بیچ میں ڈال کر صلح وصفائی کر لے مگر ایسا کرنا اس موقع پر درست نہیں تھا......اب اس کو بیوی کا دل اپنی دانش اور دوست ماسٹر اللہ راکھا کی مشاورت سے جیتنا تھا۔

ماسٹر اللہ جو مقدم کالو کا خیر اندیش تھا۔ شام کے وقت جب دونوں دوست اکٹھے ہوئے۔

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا یار مقدم کالو:

ایک دن میں نے تیسری جماعت کے ایک لڑکے سے سوال پوچھا......

تمہاری گائے کتنا دودھ دیتی ہے

تو اس لڑکے نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا......

جناب ہماری گائے خود بخود دودھ نہیں دیتی بلکہ بڑی حکمت سے اسکے آگے چارہ ڈالکر دلاسا دینا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ اپنے تھنوں میں دودھ اتارتی ہے اسکے بعد ایک ایک دھار کر کے دودھ نکالنا یا دوہنا پڑتا ہے......

ماسٹر اللہ راکھا کی رمز کو سمجھ کر مقدم کالو ہنسنے لگے اور پھر اس نے اپنی گنجان داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کوئی نئی ترکیب سوچنے میں کھو گیا......



چودھویں قسط

# مقدم کالو

مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی نفسیات میں تھوڑا بہت فرق بھی پایا جاتا ہے......عام طور پر مردوں کی ہزار ہا سال کی بالا دستی، افسر شاہی اور انکے انتخاب روزگار ہونے نے ہی انہیں مضبوط اور گٹھیلا بنا دیا۔ جبکہ عورتوں پر مسلط کی گئی ہزار ہا سال پر پھیلی ہوئی زیردستی اور گھریلو قید نے انہیں نہایت نازک اور کمزور بنا دیا......انکی جسمانی ساخت اور انکی ذہنی نشو ونما ہر دور میں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہی رہے اور یہ سلسلہ کسی حد تک آج بھی جاری ہے......یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں اکثر مردوں کے برخلاف بہت سی عورتیں کمزور طبع، توہم پسند ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی اصول کلی نہیں ممکن ہے بدلتے ہوئے اور آئندہ انسانی تاریخ میں کوئی وقت ایسا بھی آئے کہ صورت حال اسکے برعکس ہو......بہر کیف

مقدم کالو کی بیوی تسنیم غصے والی مگر خدا دوست قسم کی عورت تھی......اسکا خیال تھا کہ اللہ انسانوں کی حاجتیں برگزیدہ روحوں کے توسل سے پوری کرتا ہے اسکے لئے اسنے مختلف بزرگوں کے رینج آف ہیرنگ......(Range of hearing) مقرر کی ہوئی تھی یعنی بعض کبھی تو وہ پیروں کی قبروں کے سرہانے کھڑی ہو کر نیازیں مانتی تھی اور کبھی اسکے برعکس دور سے گویا جتنا بڑا پیر اتنی ہی بڑی اسکی رینج ہوتی

ہے......خیر

ادھراس دارفنا میں وہ گلتی سڑتیں لاشیں دیکھنے کے باوجود انسانی جسم سے انقطاع حواس کی قائل نہیں تھی عجیب قسم کی خوش گمان اور نیک دل عورت تھی۔

لیکن مقدم کالوکا معاملہ الگ ہے......

جوانی کے ایام میں وہ عجیب شخصیت کا حامل کبھی اس کی فراست نیک حکیم افلاطون اور کبھی اس حماقت غیرت شیخ چلی......کبھی وہ ہوا و ہوس کا اسیر تھا اور کبھی فکر وفن کا امیر......

وہ لڑکپن میں وہ اساتذہ کے سوالات کے عجیب وغریب قسم کے جواب دینا اس کا معمول تھا......گویا اسکی حماقت میں مزاح یا فراست چھپی ہوئی ہوتی تھی......اور اسکی ضلالت کے اندھیروں میں سراغ چشمہ ہدایت۔اس کا کہنا ہے کہ بچپن میں اس نے امتحانات کے دوران......کئی بار نیازیں مانیں اور ساتھ ساتھ وہ کوشش اور محنت بھی کرتا رہا لیکن جب واجب الادا نیازیں بہت زیادہ ہوگئیں تو اس نے اپنا مسلک بدل دیا......ویسے بھی سماجی منڈی میں مسلکوں کی کمی نہیں۔ہر قسم کے مسالک موجود ہیں......بہرکیف

مقدم کالو جسے بچپن میں جسے حقارت سے کالو کہتے تھے۔اسکے طول تجارب،طویل عمر،سعی کامل،حکیمانہ مزاج،فلسفیانہ فکر نے اس تشکیک پسند نوجواں کو ادھیڑ عمر میں مقدم کالو بنا دیا تھا۔

اسکا خیال تھا کہ کندلوگ ایک ہی نکتے یا مقام پر زندگی پر کولھو کے بیل یا خراس کے گدھے کی طرح مشقت ومزاولت کا شکار رہتے ہیں اور روایت پسند باوضع مخصوص آدمی کبھی ذہنی وفکری ترقی نہیں کر سکتے۔علم کو جب تک اپنے اوپر استعمال یا ایپلائی (apply) نہ کیا جائے تو کتابی علم کا کوئی فائدہ نہیں دیتا......



مجھے اسکے گھر سے نکالے جانے والی بات یاد آ گئی ہے......

کچھ دنوں کے رنج جدائی اٹھانے کے بعد مقدم کالو اسی وداع کی ڈیوڑھی جہاں سے وہ باھر نکالا گیا تھا...... چڑھتے ہوئے چاندسوج کی طرح وارد ہوا اسکی بیوی کو پہلے ہی اس کی متوقع آمد کا یقین تھا......نذر و نیاز تیار کی جارہی تھی۔تسنیم نے نفیس قسم کا لباس بھی پہن رکھا تھا......فطری طور پر وہ شوقین تھی کیوں نہ ہوتی باغوں میں تتلیوں کے رنگیں جامے،پھولوں کی رنگین قبائیں......رنگ رنگ کے پروں کی نمایش کرتے ہوئے پرندے اور فضاؤں میں کئی طرح کے رس گھولنے والی انکی بولیاں گویا ان مختلف جوڑوں کے باہمی دل لبھانے یا وصل ووصال کے حیلے وسیلے یا کاوشیں ہی تو ہیں۔بھلا اشرف المخلوق ان اداؤں سے کیسے بے نیاز رہ سکتے تھے......

مقدم کالو بھی سج دھج کر بڑی آن بان سے اپنے گھر پہنچا۔اور پھر وہ مبارک مہینے کا مبارک دن تھا جب وہ اپنی گلبدن راحت جاں سے اس طرح ملا......جس طرح دو آبشاریں باہم مل کر دریا بن جاتا ہے۔اس نے بغل گیر ہوکر اپنی آرام جان کو تا دیر اس طرح اٹھالیا جس طرح سازوں کی تانیں مغنی کی لے کو اٹھاتی ہیں......

پندرہویں قسط

# مقدم کالو

مقدم کالو میرے پرانے دوست ہیں۔ان کے حالات زندگی رقم کر چکا ہوں۔ ہمارے عہد کے بڑے مشہور افسانہ گو مشرف عالم ذوقی صاحب میری تحریروں کو حکایتیں کہتے ہیں بہرحال۔ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔کہ اس فخر روزگار شخصیت نے میری تحریروں کی پذیرائی کی۔

دوستوتو میں مشہور زمانہ نشانہ باز شکاری میرے عزیز دوست مقدم کالو کی نشانہ بازی کا ذکر کرنے چلا تھا۔کوئی تیس پینتیس سال پرانی بات ہے۔ایک دن مقدم کالو شکار کرنے کے لئے علاقہ بفلیاز میں پناڑ کے جنگل میں گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنگلی جانوروں کے شکار پر کوئی پابندی نہیں تھی۔اور جنگلی جانوروں کی چمڑیاں کھلم کھلا بیچی جاتی تھیں۔کسی بھی ہمالیائی پہاڑی جنگلی جانور کی چمڑی، جموں اور سرینگر شہر کی دکانوں سے مل جایا کرتی تھیں۔البتہ گیدڑ کے سینگوں جسے عام زبان میں گیدڑ سنگھی کہا جاتا ہے ہندو پاک کے لیڈروں کے علاوہ آج تک کسی کو نہیں مل سکی ہے۔

اس دور میں نے دیکھا کئی بزدل شکاری، تیندوے یا برفانی چیتے یا بھالو کی چمڑیاں دیواروں سے لٹکائے رکھتے تھے۔اور ان چمڑیوں کے آس پاس ہی کارتوسوں سے خالی بندوقیں بھی کیلوں سے لٹکی ہوئی دیکھی جاتی تھیں۔

جوانی کے دنوں کی بات ہے۔میرے دوست مقدم کالو جن کو میں انکے بالوں کی



کثرت اور اپنے دلی پیار کی وجہ سے،کبھی کبھی مقدم بھالو کہا کرتا ہوں کو بھی شکار کا شوق چڑھا۔انکے نشانہ بازی کی مثالیں اب بھی دی جاتی ہیں۔

ایک بار انہوں نے شکار کا پکا سراغ ملنے پر، نشانہ تو چیتے پر باندھا تھا لیکن فائر مس (Miss) ہو جانے پر قریبی جھاڑیوں میں جا لگا۔ چیتا فائر کی آواز سنتے ہی بجلی کی طرح لہراتا ہوا صحیح سلامت بھاگ نکلا۔لیکن چیتے سے کوئی 100 میٹر کی دوری پر چھپا ہوا گیدڑ فائر کی زد میں آ گیا تھا۔یاد رہے یہ فائر مقدم کالو نے بڑے کلوز رینج (Close range) سے کیا تھا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے شکاری تھے۔ میں عوام کو انکی قدر شناسی پر داد دیتا ہے۔عوام انکو اپنے وقت کا بہترین شکاری سمجھتے ہیں۔

آج میں اور میرا عزیز دوست مقدم کالو اپنی اپنی عمر کے پانچ مقدس عشرے پورے کر کے چھٹے کی سیر کر رہے ہیں۔تیس پینتیس سال بعد پچھلے دنوں میں انکے گھر گیا۔اپنی شکل وعقل اور اپنے عزیز دوست کی وضع میں بالوں کی سفیدی کے علاوہ کوئی فرق نہیں پایا۔

میں نے مقدم کالو سے پوچھا: یار آپ نے اپنے گھر میں برفانی چیتے کی چمڑی ابھی تک ویسے ہی ٹانگ کر رکھی ہے۔انہوں نے بات گھما دی۔ دراصل مقدم کالو اپنی بیوی سے حسب دستور آج بھی بہت ڈرتے ہیں۔ جب وہ ہمیں چائے پلا کر مہمان خانے باہر چلی گئی تو سوال دہرانے پر مقدم کالو نے فخر سے سر اونچا کر کے کہا۔ یار آپ کو معلوم ہے ناں! میں بھی کسی زمانے میں نامی گرامی شکاری ہوا کرتا تھا۔ مجھے دوست کی ڈینگ سن کر ہنسی نکل گئی۔اور ان کا نشانہ چوکنے سے بلا وجہ گیدڑ کی موت کا واقعہ یاد آ گیا۔اور یہ بھی یقین ہو گیا ہماری طبیعتیں بحال ہیں۔ جب میں نے اپنے دوست مقدم کالو کو گیدڑ کی موت یاد کرائی تو انہوں نے لجاجت سے سر جھکا دیا۔اور کہنے لگے ہی ہی واقعی گیدڑ مارا گیا تھا۔

قسط اول

# کھکھا چوھڑا

بازار سے باہر ایک نالے کے اس طرف ایک کچے سے مکان میں وہ اور اسکا خاندان رہتا تھا......سماج نے انہیں تقسیم کے وقت خاکروبی کے علاوہ مردہ جانوروں کی لاشوں کوٹھکانے لگانے کا کام سونپا تھا۔ ہزاروں سال سے اسکے آباءواجداد کڑا کے کی گرمیاں اور سردیاں جھیلتے ہوئے یہ کام خوش اسلوبی سے نبھاتے آئے تھے۔ ہزاروں سال کی مشقت نے انکا رنگ گہرا سیاہ بنادیا۔ جب کبھی انکے پھٹے ہوئے کپڑوں سے کالے بدن ڈرموں سے بہہ رہی تارکول کی طرح جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے تو نجانے کیوں میرے دل سے دھواں اٹھنے لگتا تھا۔ خیر کھکھے چوھڑے کے بیٹے بیٹوں اور بیوی نے اپنا اپنا کام بانٹا ہوا تھا۔ اسکے چھوٹے بیٹے ہلکا کام مثلاً۔ چھوٹے مرے ہوئے جانوروں کتے بلیوں وغیرہ کی لاشیں گھسیٹ کر بازار سے دور پھینکتے تھے اور کھکھے کی بیوی صبح سویرے شہر کے اشرافوں کے سنڈاس خالی کیا کرتی تھی اسکے علاوہ اپنے گھر کا کام کاج بھی کرتی تھی......کھکھے چوھڑے کی بیٹیان تیلیوں سے ٹوکریاں بن بن کر بیچا کرتی تھی۔ کھکھا اپنے روایتی اور بھاری کاموں کے علاوہ ڈھول اور باجا بھی بجاتا تھا......دن کو ڈھول بجا بجا کر منادیاں کرنا وغیرہ اسکا روزمرہ کام تھا۔



اسکے علاوہ کچھ لوگوں کے سپٹک ٹینکس (Septic Tanks) صاف کرنا وغیرہ کا۔ کھکھا ہمیشہ گہری سوچ میں غرق رہتا تھا۔ اسے اپنی بیٹیوں کی سخت فکر تھی کیونکہ شہر کے کچھ نام نہاد شرفا نے کھکھا چوھڑے سے کہا تھا......اب تمہاری بیوی ہمارے سنڈاس اچھی طرح صاف نہیں کرسکتی ہے......اور یہ کہ وہ اس کام کے لئے اپنی جوان بیٹیوں کو انکے گھروں میں بھیجا کرے......

کھکھا بڑا اغیرت مند قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کبھی یہ مناسب نہیں سمجھا لہذا وہ انکے عتاب کا شکار رہتا تھا۔

اس بستی کے شرفا کے سب عیب کھکھے چوھڑے نے اپنی پوٹلی میں باندھ رکھے تھے مگر انہیں آخری سانس تک وہ فاش نہیں کرسکتا تھا......

جب خواجہ ایاز کا سپٹک ٹینک چوک (Choke) ہوگیا اور وہ کھکھے چوھڑے کے گھر گیا......کھکھے کا موڈ ٹھیک نہیں تھا اور صحت بھی خراب تھی......

خواجہ ایاز نے اسکی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ کھکھا اصل میں خدمتِ خلق تم کرتے ہو......لہذا اصلی دین دار تم لوگ ہو۔ اسکے بعد خواجہ ایاز نے عربی مقولہ بھی پڑھا۔

خیر الناس من ینفع الناس......کھکے کی بلا جانے۔ اس نے اتنا ضرور کہا:

ہم چائے آپکے گھروں میں پیتے ہیں لیکن تم ہمارے گھر نہیں پیتے۔

اسکے بعد کھکھے نے کہا تم نے ہمارے پینے کھانے کے لئے نشان زدہ برتن الگ رکھے ہوئے ہیں۔ خواجہ ایاز کو یاد آیا کہ انکی دادی کھکھے کی تھالی اور پیالی کچن سے باہر جوتوں والی الماری میں رکھا کرتی تھی۔ شعر

ہندو بھی مزے میں ہے مسلماں بھی مزے میں
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اسکے بعد کھکھے نے لمبی آہ بھری اور کہا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار ھندو سماج سے منسلک

ہیں اور ہمارے باپ نے یہاں مسلمانوں کی بستی میں اسلام قبول کیا تھا لیکن پچھلے پچاس سال گزرنے پر بھی یہ احساس ختم نہیں ہوا بلکہ ہر آئے دن تازہ ہوتا رہتا ہے......

ہم تب بھی چوڑھے تھے......

ہم اب بھی چوڑھے ہیں

ہم وہاں بھی چوڑھے ہیں

ہم یہاں بھی چوڑھے ہیں

مجھے ہندو سماج والے لوگ بچپن اور لڑکپن کے ایام میں کھکھا چوھڑا کہتے کہتے تھے اور تم آج بھی حسب دستور مجھے کھکھا چوھڑا کہتے ہو......

ہاں! کھکھا چوھڑا



قسط دوم

# کھکھا چوھڑا

انسانی معاشرے کو ذات پات نے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ہندوستانی سماج میں منوسمرتی کے مطابق سماج چار ذاتوں میں تقسیم کیا گیا تھا......یعنی برہمن کو برہما کے منہ سے۔ کھشتری کو بازوں سے...... ویش کو پیٹ سے اور شودر کو چرنوں یعنی پاؤں سے......اس ذات پات کے نظام نے ہزاروں سال انسانیت کی دھجیاں اڑائیں...... پاٹلی پتر کے قدیم شہر میں سورج چڑھنے کے بعد اور غروب سے پہلے کوئی شودر داخل نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ مقدس کتابوں کے مطابق کسی بھی شودر کا سایہ برہمن پر پڑنا درست نہ تھا......انکے علاوہ جب کوئی شودر شہر میں داخل ہوتا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے گلے سے ایک مٹکی باندھ کر رکھے کیونکہ مقدس شہر میں شودر کا تھوکنا اور پیشاب کرنا منع تھا۔ یعنی شہر میں آنے جانے کے مقررہ اوقات میں بہر حال اس شودر کو اپنا تھوک اور ٹٹی پیشاب اس گلے سے لٹکتی ہوئی مٹکی میں جمع کر کے اپنے ساتھ واپس لے جانا ہوتا تھا...... یہ انسانیت سوز تاریخی واقعات آج بھی پرانی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں......

اکابر پرستی، نسل پرستی یا نژاد پرستی دنیا کے ہر کونے میں پائی جاتی تھی......گورے خود

کوکالوں سے افضل سمجھتے تھے۔اسی طرح یہودی خودعیساؤں سے برتر سمجھتے تھے۔اسی لئے انہوں نے عیسی کو پھانسی دینے کی تجویز بنائی تھی۔

جرمن لوگ دوسری اقوام کو پست سمجھتے تھے وغیرہ اور قدیم عربی لوگ عجمیوں کو غلام بناتے تھے الغرض پرانی تاریخ کا ہر ورق اس قسم کی ناانصافیوں سے بھرا پڑا ہے خیر کھکھے چوھڑے کا باپ اور وہ خود بھی دوسرے قصبہ سے مسلمانوں کی بستی میں آ کر اسلام قبول کیا تھا اور پچاس سال بلکہ مرتے دم تک وہ اور اسکی بیوی اسلام پر کاربند و عمل پیرا رہے۔لیکن مسلمانوں کے ناروا سلوک اور نفرت نے ان کے بیٹے بیٹیوں کو سوچنے پر مجبور کیا......اسکی بیٹیاں جوان ہو چکی تھی اسکے بیٹوں کو رشتہ تو دور کی بات کوئی مسلمان ان سے ہاتھ ملانے کے لئے تیار نہ تھا......

بستر مرگ پر کھکھے سے اس کے بیٹے بیٹیوں نے سوال کیا......

ہمارے مہربان باپ آپ نے اسلام قبول کیا لیکن یہاں کے مسلمانوں نے ہمیں مسلمان نہیں سمجھا اور نہ ہی آپکو......

اب چلو واپس اپنی پرانی بستی کے رشتہ داروں میں جا کر ہندو ہی بن جاتے ہیں۔لیکن کھکھے چوڑھے نے کہا۔

”میں تو مسلمان ہوں مجھے مسلمان رہنا ہے......حشر کے دن آپکے یہ سوالات، رسول خدا کے سامنے پیش کروں گا۔مجھے ان لوگوں سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ یہ ابھی خود بھی پوری طرح اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔اگر یہ لوگ واقعی مسلمان ہوتے تو ہم سے اہل ہنود و یہود جیسا ناروا سلوک نہیں کرتے۔یہودیوں کا خیال ہے کہ مذہب خون کے ذریعے ہے کہ قبولیت کے ذریعے......یہ لوگ ظالم یہودیوں سے بھی بدتر ہیں“ یہ کہہ کر وہ جذباتی بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگا۔شہر کا کوئی بڑی توند والا قاضی، کوئی کلاہ والا پیر اور کوئی گلابی ملا اور کوئی شہوت پرست باجی الغرض سب اسکے



درد سے بے خبر تھے۔کھکے کی بیوی کا بھی غم و غصے سے چہرا سرخ ہوا جا رہا تھا......اس دن بیٹے بیٹیوں نے مل کر آخری بار خوب رونا رویا......

کھکھے کی وفات و تجہیز و تکفین کے بعد اسکے بیٹے بیٹیاں پرانی بستی میں چلے گئے......لیکن وہاں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ انکے رشتہ دار ہندوؤں کے ناروا سلوک اور نفرت سے تنگ آ کر سب کے سب کرسچن یعنی عیسائی ہو چکے ہیں۔انہوں کی تلقین اور ترغیب کے نتیجہ میں کھکھے کا پریوار اب عیسائی ہو گیا۔شعر

نہ تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

آجکل کھکھے کا بڑا بیٹا ڈھول بجاتا ہے چھوٹا بیٹا شہنائی اور اس سے چھوٹا۔سارگی......تینوں نے ایک مخصوص سرخ رنگ کی وردی بھی بنائی ہے......مل کر بیاہ شادیوں میں جاتے ہیں شام کے وقت آپس میں مذاق کرتے ہیں۔انکا کام ہندو سماج میں زیادہ چلتا ہے۔کیونکہ عام انتہا پسند مسلمان ڈھول بجانا حرام سمجھتے ہیں جبکہ امیر مسلمانوں کی شادیوں میں موسیقی ڈانس کا اہتمام و انتظام کیا جاتا ہے بلکہ کلوز سرکٹ ٹی وی (Close Circuit T.V) بھی لگائے جاتے ہیں......غور کا مقام ہے۔کہ کھکھے جیسے کئی چوھڑوں کے ڈھول بجانے ناجائز قرار دئے جاتے ہیں انکے سازوں سے لوگوں کو نفرت ہے جبکہ کوئی بسم اللہ خان یا آر ڈی برمن کا چیلا آئے تو اشرافیہ کو اسکا شو دیکھنے کے لئے ٹکٹوں کا اہتمام کرنا پڑتا ہے بلکہ انکو تو بقعے پیش کئے جات ہیں۔بہرحال

شام کے وقت کھکھے کے بیٹے بیٹیاں آپس میں خوب ہنسی مذاق کرتے ہیں۔اور سماج کا دیا ہوا ہر غم بھول جاتے ہیں۔کھکھے کی بڑی بیٹی انو جسے پہلے ایک مسلمان لڑکے سے پیار ہوا تھا۔اس نے انو سے اپنی ہوس پوری کر کے فراموش کر دیا تھا۔پھر

ایک ہندو لڑکے نے بھی اسے دھوکہ دیا......وہ سخت دکھی تھی۔

ایک دن انہوں نے اپنے بھائی سے مذاق میں کہا۔

بھائی...... بجتے وقت تمہارا ڈھول ان اندھے سماجوں کے اندھے لوگوں کے متعلق کیا کیا کہتا ہے؟

ڈھولی بھائی نے کہا

''درفٹ موں''

''درفٹ موں''

انو نے شہنائی والے بھائی سے پوچھا بھائی تمہاری یہ شہنائی کیا کہتی ہے۔اس نے کہا۔یہ پوچھتی ہے کہ یہ ''درفٹ موں''

''کنہاں نوں کنہاں نوں''یعنی کسکو؟

ادھر سے ہنستا ہوئے سارگی والے بھائی نے جواب دیا۔

''اینہاں نوں اونہاں نوں''

یعنی کچھ اِدھر کے لوگوں کو درفٹ موں

کچھ اُدھر کے لوگوں کو درفٹ موں۔مراد جنہوں نے کھکھے کے پریوار کو ٹھکرایا تھا۔ اسکے بعد ان کی ہنسی پھر کسی تاریک غار کے سناٹے میں کھو جاتی ہے......



# چاندنی

## کہانی

(کہانی ایک شریف النفس بھینس کی)

شاعرِ طاغوتی ہے اس شخص سے بھینس اچھی
دودھ سے جس کے نہیں آتی ہے بو فتنوں کی

پنجاب ، پنجاب کے نواحی علاقوں اور کشمیر کے چار چفیری دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں پر یہ شریف النفس جانور گھر گھر کی زینت ہے۔عربی میں بھینس کو الجاموس کہتے ہیں اس کا یہ نام سنتے ہی میرے ذہن میں پرانے حکیموں کا تصور ابھرنے لگتا ہے مثلاً بطلیموس جالینوس وغیرہ لیکن یہاں صورت مختلف ہے جب بھی کوئی بھینس کی بات کرتا ہے تو اسکی شبیہ میری آنکھوں کے آگے آجاتی ہے......

یہ شرافت کا پیکر حیا کی کان......مظلوم و بے زبان......

دوسرے وحشی اور احمق جانوروں کی طرح کسی کو گزند نہیں پہنچاتی ہے۔ مجھے تو بدبودار بالوں والی بکری بھی اس کے مقابلے میں ہیچ لگتی ہے بکری کا دودھ پتلا اور اس میں عجیب سی باس ہوتی ہے۔

ایک دن میں بھینس کی صفت وثنا کر رہا تھا۔ پڑوسی نتھو جی کو سخت کوفت محسوس ہوئی

کیونکہ اس نے گایاں ہی رکھی تھی۔اور گایوں کے بارہ میں اس خیال تھا کہ وہ بھینسوں سے زیادہ شریف اور مقدس جانور ہیں لیکن ہماری بحث آخر پھر دودھ پر پہنچ کر ختم ہو جایا کرتی تھی۔ میں اسے لاجواب کر دیا کرتا اور وہ بھی ہٹ دھرم اور ضدی نہیں تھا گائے کا دودھ پیلا ہوتا ہے اور مکھن بھی۔کبھی کبھی میں اسے کہتا دیکھو تو سہی بھینس کے دودھ کا لبالب بھرا ہوا چھنا۔آہا کتنا سفید جھاگ دار خوشبودار۔تازہ تازہ گرما گرم اس کو پی کر تو مجھے تسنیم و کوثر کی یاد آنے لگتی ہے اور جاٹوں سے موج مستی کرنے کو دل کرتا ہے......

باقی پالتو جانور بھی اس کے مقابلے میں مجھے اچھے نہیں لگتے،،نگوڑا گدھا تو گدھا ہوا اسکا مسیرا بھائی چھیل چھبیلا گھوڑا جو کبھی غازیوں کی جان تھا...... مجھے تو وہ بھی اس بھینس کے ایک سینگ کے مول کا نہیں لگتا۔

ایک مرکبان جسکی روزی روٹی گدھے کے سر تھی......ایک دن مجھ سے الجھ بیٹھا۔ لیکن جب میں نے اسکے گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں کی بات چھیڑی......تو وہ بھی خجل ہوگیا۔ یہ ڈھینچوں ڈھینچوں بڑی ہی مکروہ اور کراہت آمیز آواز ہے۔وغیرہ وغیرہ۔ الغرض میں نے گدھے کی ایسی ہجو بیان کی کہ چوپان نے مجادلہ ومباہلہ میں ہارے ملاؤں کی طرح اپنا سر نیچے جھکا لیا......اور بے قابو ہوکر گلے سے باندھی ہوئی میری کالی آنکھوں والی چاندنی کے لمبوترے منہ پر جا کر دو تین بوسے دیدئے۔سبحان اللہ

غیر محرم کے بوسوں کی بوچھاڑ پر چاندنی کو سخت شرم وحیا آگئی تھی

اس لئے کچھ دیر کے لئے اسنے اپنی آنکھیں بند کرلیں......ادھر مجھے چاندنی پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔کتنی حیادار ہے کتنی شرم والی......

جب میں نے دلاسا دیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے لگی......

چاندنی کی شرافت پر کسی کو شک کی گنجایش نہیں...... بھاری بھر قم جیسا جثہ...... چلتے



وقت اسکے ہلتے ہوئے کولہے......آہا وہ پیٹ کا عرض وطول بلد اللہ اللہ۔ چلتے وقت اسکا اوپر نیچے ہلتا ہوا سر مجھے سُر اور تال کی طرح لگتا تھا......اور چلتے قدموں کی آہٹ ڈھولک کی تھاپ جیسے محسوس ہوتی۔

راستے پر ٹکی ہوئی حیادار آنکھیں اسکے ٹیڑھے میڑھے، پیچھے کی طرف مڑے ہوئے سینگ......اگر خدانخواستہ کبھی بچوں کی شرارتوں سے تنگ آکر اپنا سر ہلا بھی دیتی تو بھی بے ضرر تھے......

یارو میں تو بھینسوں کا شیدائی ہوں مسلکاً یہ صوفی صافیوں جیسی......بے ضرر ہیں اور طبعاً گھریلو عورتوں جیسی......رحم دل بھینسوں پہ میں کیوں نہ شیدا ہوتا، جب میں چھ مہینے کا ہوا تھا کہ میرے دادا جان نے مجھے بھینس کا مٹھا دودھ پلانا شروع کر دیا تھا......

اس بھینس کے ماتھے میں قدرتی چاند تارا تھا......اسی نسبت سے اسکا نام بھی چاندنی تھا......

ایک دن چاندنی گاوں میں ایک مالکِ سرکار اراضی کے ٹکڑے پر گھاس چر رہی تھی یہ سانجی چران یا گھاہ چرائی والا ایک سرب نیلا میدان تھا......اچانک کچھ لاٹھیوں اور سلاخوں سے مسلحہ افراد کو اپنی طرف دیکھ کر اس کا ''طراہ'' نکل گیا......دراصل یہ لوگ دو فرقوں سے وابستہ تھے......ایک فرقہ والوں کے ہاتھوں میں ہری ہری جھنڈیاں اور دوسرے فرقہ کے لوگوں نے بگلوں کی طرح پانچے چڑھا ہوئے تھے۔بے سرے...... تندمزاج فتنہ پرور لوگوں کو دیکھ کر...... مجھے محاورہ یاد آیا......

آب نہ دیدہ ''پانچہ'' کشیدہ۔

سچ مچ انہوں نے تو دریا دیکھا ہی نہیں تھا تو پھر یہ پانچے کیوں چڑھائے ہوئے تھے۔

بہرحال......

چاندنی نے سمجھا وہ اس پر حملہ کرنے آ گئے......تھوڑی دیر ڈر گئی پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔لیکن یکا یک مولا نے اسے ایسی ہمت بخشی کہ وہ۔نتھنے پھیلا پھیلا کر ماں کی طرح انہیں دست گریباں ہونے سے روک لیا آخرہ وہ فریقین کی رضائی ماں ہی جیسی تھی اور صلح کل بھی...... مجھے اس کے کھر پھسل کر گرنے کا ڈر تھا جلدی جلدی میں نے کہا: ہوش دردم ......نظر برقدم“

آخر جدی پشتی صوفیوں کے گھر کی تھی۔سمجھ گئی......سنبھل گئی تب تک وہ انہیں بھگا چکی تھی چاندنی نے منفی اندزاز میں اپنا سر ہلا ہلا کر زوردار قہقہے لگائے۔کتنی سیانی اور سگڑھتی چاندنی......

میں چپ ہی رہا ہنسنا تو ہنسنا تھا مسکرایا بھی نہیں کیونکہ ملانوں کی نظر میں، میں بچپن سے ہی مشکوک تھا......چاندنی میرے پاس آ کر میرا ہاتھ چاٹنے لگ گئی۔



# سیکنڈ ڈویژن

مختصر افسانہ

کیچڑ میں پڑا ہیرا، ہیرا ہوتا ہے لیکن اس کو پہچاننے کے لئے جوہری کی آنکھ چاہئے......لیاقت ویسی آنکھ سے محروم تھا......

لیاقت نے اپنی منگیتر شائستہ...... جو پہلی بہار کے تازہ پودوں جیسی دلکش تھی کو بھلا دیا......وہ اکثر ملجگا سا لباس پہنتی تھی......سچ مچ وہ بادلوں میں پہلی کا چاند جیسی خوبصورت تھی۔ایک لیاقت کے سوا ہر کوئی اسے دیکھنے کے لئے بیتاب تھا......

کیونکہ کالج میں داخلہ لیتے ہی وہ اپنی ہم جماعت نازیہ کی ظاہری آرائش پر ریجھ گیا تھا۔کسی نے سچ ہے کہا ہے کہ انسان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی......نازیہ شکل و سیرت کے کیا کہنے؟ وہ بلا ناغہ ہر روز بیوٹی پارلر جایا کرتی تھی۔رہی بات کردار اور سیرت کی ان دونوں عیبوں کو ڈھانپنے کے لئے اس کے پاس بہت سے قیمتی کپڑے اور بیش بہا زیورات موجود تھے۔

لیاقت کئی سال نازیہ کے چکر میں پڑا رہا۔لیکن پتھر سالہا سال پانی میں پڑا رہنے کے باوجود نرم نہیں ہوتا۔نازیہ بھی امیری کے نشہ میں رہی اور وہ لیاقت کی محبت اور ذہانت سے ذرہ بھر متاثر نہ ہوئی اور آخر کار غریب جان کر اسے مسترد ہی کر دیا۔لیاقت

نے جیسا کیا ویسا ہی پایا......

لیاقت کو دوبارہ پٹری پر چڑھنے میں کئی سال لگے...... جب اسکا ہوش ٹھکانے پر آیا تو اسے شائستہ کا خیال آیا۔لیکن بہہ چکا وقت کا دریا کبھی پیچھے نہیں مڑتا۔اب شائستہ کسی حویلی کی زینت بن چکی تھی اور دو تین بچوں کی ماں۔

بیچارے شکستہ بے روزگار دل لیاقت کے پاس حسرتوں کی ایک بڑی پوٹلی کے علاوہ یہی کچھ ایک ڈگری تھی اور وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں......



# ڈینگی مچھر کی نئ نسل

مختصر کہانی

ڈینگی مچھر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔اس چھوٹی سی مخلوق نے اپنی حسن کارکردگی اور وفاداری نبھانے کی وجہ سے مقدس اساطیر اور کہنہ داسنانوں میں اپنی جگہ بنائی تھی۔

کہا جاتا ہے۔اسے حضرت ابراہیم کی محبت کا شرف حاصل ہے۔جب نمرود نے ابراہیم کو پریشان کر رکھا تھا تو ایک مخصوص ڈینگی مچھر کو غصہ آ گیا اور وہ نمرود کے نتھنوں کے ذریعے دماغ میں جا گھسا......اور اسے گدھ کی طرح نوچنا شروع کیا۔اور نمرود اسی درد کے مارے......بلبلاتا بلبلاتا مر گیا......جدید مولویوں کا ماننا ہے کہ نمرود ڈینگی سے مرا تھا ڈینگی کا خطرناک بخار اسکے دماغ میں چڑھ گیا تھا......سبحان اللہ......ہمیں اس ڈینگی مچھر کا مدفن ملتا تو مزار بناتے......خیر

اس مچھر کی نسل اب بھی دنیا میں موجود ہے لیکن وہ دین ابراہیمی سے منحرف ہو چکی ہے۔ان میں وہ مہمانوازی کا سلیقہ نہیں رہا......وہ انسان دوستی کی رسم گویا دنیا سے مٹ ہی چکی ہے۔وہ حسن اخلاق،اور جزب ایثار باقی نہیں رہا......اس نئ ڈینگی مچھر کی نسل کو انسانوں سے محبت کے بجائے سخت نفرت ہے۔یہ بلاتفریق مذہب و مسلک ہر

انسان کو اپنا نشانہ بنا رہی ہے۔ بموں سے اڑا رہی ہے۔ آج کل اسکی چھاؤنیاں دریا دجلہ کے کنارے اور متصل عرب علاقہ جات میں قائم ہو چکی ہیں۔ مزید محض اسلام مقدس کی آڑ میں نہیں بلکہ کئی دیگر مذہبی لبادوں اور دہشت گرد قالبوں میں ڈھل کر افغانستان برما، بھارت اور پاکستان میں بھی اپنی انسان دشمن کارستانیوں میں مشغول ہے۔ ڈینگی مچھر کی اس نئی نسل سے بچنے کا ابھی تک کسی بھی ملک کے پاس کوئی مکمل علاج نہیں۔ پنجاب اور دلی جیسے گرم علاقوں میں رہنے والوں کو ڈینگی سے زبردست خطرہ لاحق ہے......



# ائیر بڈ

(افسانہ)

پیر پنجال کے دامن میں جہاں میٹھے پانیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ کئی گاؤں بھی آباد ہیں۔ قدرت کی کچھ ایسی تقسیم کاری ہے کہ ہر گاؤں میں بیسیوں چشمے موجود ہیں۔ ہر گاؤں کا اپنا جنگل بھی ہے......لوگوں کو اپنے اپنے چشمے۔ چراگاہیں خوب ذہن نشین ہیں۔ حتی کہ سیاہ راتوں میں کسی کو پانی کا مٹکا لانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ گویا نابینے حافظوں کی طرح انکو بھی اپنے مخصوص راستے ازبر ہیں۔

کافی مدت کے بعد میں نے اپنے گاوں کا مشاہدہ کیا۔ معلوم ہوا کہ بیشتر کچے مکانوں کو اکھیڑ کر انکی جگہ پکے مکان بنایے جا چکے ہیں......گاوں کی دس بارہ کچی مسجدوں کو بھی بدلا جا چکا ہے پکی مسجدوں کے مینارے اونچے ہو چکے ہیں......

سحری کے وقت لاوڈ سپیکر پر ایک مولوی صاحب نے کرخت سی آواز میں کچھ گانا شروع کر دیا پہلے تو ناماموس اور مشتبہ آواز سن کر میں سہم سا گیا بہرحال جیسی کیسی تھی وہ انسانی آواز ہی تھی۔ وہ کم بخت بھونڈی آواز میں میاں محمد صاحب کے شعر گا رہا تھا......

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر موسیقار کا خیال ہے کہ وہ تان سین سے کم نہیں اسی طرح ہر مغنی یا مغنیہ خود محمد رفیع یا لتا منگیشکر سے کم نہیں سمجھتا۔ کاش یہ گلا پھاڑ پھاڑ کر

بھانڈوں اور بے ڈھب قوالوں کی طرح گانے والے کسی سے اپنی آواز کے بارہ میں پوچھ تو لیتے...... خیر اس نور پیر کے وقت میں سوچ رہا تھا کیا یہ نزولِ خدا کا وقت ہے یا پھر اسکے صعود کا۔

مولوی کی مشتبہ آواز سنتے ہی گاؤں کے اطراف کے جنگل سے '' آہو آہو...... باہو باہو...... یہو یہو۔ کی آوازیں اس زور شور سے آنے لگیں کہ پل بھر کے لئے میں نے سوچا کسی دشمن نے ہمارے گاؤں پر دھاوا بول کر قبضہ کر لیا ہے...... دیر بعد میرے مکان کے قریب بھی ایسی ہی آواز آئی میں نے جسارت کر کے کھڑکی سے باہر ٹارچ لگا کر دیکھا۔ یہ سب شرارت گیدڑوں کی تھی...... خیر،

اسکے بعد تقریباً سب مسجدوں سے مختلف آوازیں آنے لگیں۔ کوئی قوالی پڑھ رہا تھا۔ کوئی مقامی بولی میں بیت سنا رہا تھا۔ کوئی مخصوص درود پڑھ رہا تھا۔ کوئی کچھ اور...... یہ سب اذان سے پہلے کی باتیں ہیں گویا سپیکروں کی آوازوں کا باہمی تصادم بھونچال کی چرچراہٹ جیسا ہولناک تھا۔ مجھے کسی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا یاالٰہی کیا آج کی رات پھر حضرت بلال کی انتظار میں لمبی تو نہیں ہوگئی ہے۔ سحر نہیں ہو رہی۔ بیچ میں گڈمڈ آوازوں میں کچھ سمجھ میں آتا تھا اور کچھ نہیں۔ مجھے کچھ دیر کے لئے اپنے آپ پہ شک ہوا کہیں کچھ حواس مختل یا مخبوط تو نہیں ہو گئے۔ ٹیبل پر زور دار تھپکی مار کر چیک کیا تو تھپکی کی آواز ٹھیک ٹھاک سنائی دی...... خوشی کی انتہا نہ پوچھئے۔ لیکن ملانوں کا شور بدستور جاری تھا۔ انکی آوازوں سے متخلل ہو کر پالتوں جانور بھی بلبلا رہے تھے۔ ایسا اکثر کسی آسمانی آفت کے نزول سے پہلے ہوتا ہے کتابوں میں پڑا ہے کہ آسماں کی طرف منہ کر کے کتوں لومڑیوں گیدڑوں اور دیگر جانوروں کا رونا یا چلانا اچھا شگون نہیں۔ سب کچھ ہو رہا ہے مگر سحر نہیں ہو رہی تھی......

آخر میں نے ائیر بڈز کا پیکٹ کھولا اور دو دو بڈز کو اکٹھے کر کے اپنے ہر ایک کان



میں بے رحمی سے ٹھونس لیا۔ خدا سے گلہ شکوہ بھی کیا کہ آنکھوں کی طرح کانوں کے بھی ڈھکنے ہونے چاہئے تھے۔

خیر بھلا ہوا ئیر بڈز بنانے والے کا!

مجھے شور سے نجات مل چکی تھی۔ کیا معلوم کب اذان ہوئی۔ البتہ صبح سویرے میری بیوی میرے کانوں میں جڑیں پکڑ چکی ائیر بڈز کو دیکھ کر حیران ہوگئی تھی۔ لیکن اب تو ان پر پھول پھل لگ چکے ہیں۔

# پچھلا حساب

(افسانہ)

منشی نجم دین کے گھر دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا......عام لوگوں کے علاوہ اس بابرکت محفل کچھ پیر صوفی اور مولوی حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ساتھ ہی میں بھی بھیگی بلی کی طرح دبک کر ایک کنارے پر بیٹھا تھا کیونکہ مجھے تو یہ حضرات، داڑھی مونچھ چٹ......مسٹنڈا سمجھتے تھے۔کھانے کا انتظار ہورہا تھا۔کسی نے پیر صاحب کو پانی کا گلاس پیش کیا پیر صاحب بولے:

''میں ٹینکی کا پانی نہیں پیتا" ایک مرید خاص نے کہا:

کیوں حضرت کیا وجہ ہے؟

پیر صاحب نے کہا: ٹینکی کا پانی آب جاری کے زمرہ میں نہیں آتا۔لہذا انکے لئے چشمہ سے تازہ پانی لایا گیا......سب نے کہا سبحان اللہ......

میں نے دیکھا کہ پیر صاحب خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔انکا بھاری جثہ کرتے پاجامے سے پھٹ کر باہر آنے والا تھا......پیر صاحب کے تقوے کی بات سنکر مفتی صاحب بھی کھنکھارتے ہوئے بولے:

''میں کھانے کے بعد اپنے ہاتھ صابن سے نہیں دھوتا نعوذ باللہ کھانا تو پاک چیز



ہے ناں۔سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور سبحان اللہ کہا۔اللہ اللہ۔

تیسرے پڑھے لکھے مولوی نما ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا:

''میں چھوٹے تالاب یا حوض میں غسل ارتماسی (یعنی غوطہ خوری والے غسل) کو درست نہیں سمجھتا۔کیونکہ نجاست دور ہونے کے بجائے پانی کے ہر قطرے میں حل ہوجاتی ہے۔لہذا غسل روایتی یا ترتیبی ہی کرتا ہوں۔بوجھل الفاظ سن کر جب کچھ نیم پڑھے لوگوں نے وضاحت طلب کی تو ہیڈ ماسٹر غسل کی کئی قسموں پر جم کر روشنی ڈالدی......

چوتھے صاحب جو غالبا نابینا حافظ تھے بولے:

''بجلی یا برقی لیمپ لگانا یا استعمال کرنا روا نہیں سمجھتا۔''

انکی بات سنتے ہی مجھے شرم آگئی اور میں پسینہ میں ڈوب گیا۔جب کسی نے اس کی علت پوچھی تو وہ بولے:''رات کی قدرتی تاریکی کو دن کے اجالے میں بدلنا خلاف فطرت ہے اور اگر لوگ اس طرح راتوں کو جاگیں گے تو صبح کی نماز قضا ہونے کا احتمال ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ میں کسی تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا۔

اسی مسئلے کو لے کر 1911 میلادی میں ملاؤں کی شہ پر لوگوں نے مشہد کا بجلی گھر جلادیا تھا۔اور......

پیر صاحب مفتی صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب اور پھر حافظ صاحب کے بعد۔

چیدہ چیدہ لوگوں نے اپنے اپنے تقوے کی باتیں سنائیں۔ایک داڑھی والا مرتشی پٹواری بولا۔

میں کلائی والی گھڑی نہیں باندھتا۔کیونکہ یہ اکثر لوہے سے بنی ہوتی ہے اس لئے ہنود یا سکھوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے......سب نے کہا سبحان اللہ

ایک ہری پگڑی والا کمپونڈر بولا: ''میں کیلشم کی ٹیبلیٹ (Tablet) کھانا درست نہیں سمجھتا کیونکہ مردہ جانوروں کی ہڈیوں کو پیس کر تیار کی جاتی ہے کیا پتہ جانور حلال ہو یا حرام......''

سب نے کہا شاباش...... جیتے رہو......

اور دین کی روشنی بکھیرتے رہو......سبحان اللہ

دہ کے مولوی صاحب نے کمپونڈر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔البتہ اسکو تم شہد کے ساتھ یا چائے کے ساتھ کھا سکتے ہو۔کیونکہ وہ خود ہڈیوں کی بیماری میں مبتلا تھا......اور مسلسل کیلشم کی ڈوز لے رہا تھا......ساتھ ہی اسنے بولا امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق شراب بطور دوا استعمال کرنا جائز ہے۔تو پھر کیلشیم کے استعمال میں کیا فرق ہے۔؟

سفید چادروں میں ملبوس ریٹائرڈ صوبیدار جو اسی سال حج کر کے آیا تھا اس نے کہا: ''لباس سینے والی مشین کا سیا ہوا لباس حدیث میں نہیں آیا میں مکہ کے عالموں سے پوچھ کر آیا ہوں۔میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اللہ پاک مجھے حج کے بعد مشینی سئے ہوئے کپڑے نہ پہننے کے عہد کو پورا کرنے کی توفیق دے......سب نے ہاتھ اٹھا کر اسکے لئے دعا کی۔

اسکے بعد لمبی لمبی داڑھی والے مکھن دین صاحب جو دوسرے گاؤں سے آئے تھے سوکھے سڑے ہوئے خشک زاہد معلوم ہوتے تھے داڑھی پر ہاتھ پھیر کہنے لگے......

''عورتوں سے مشورہ کرنا درست نہیں بلکہ شادی بھی نہ کی جائے حوا نے آدم کو دانۂ گندم کھانے میں مدد کی......لوط کی بیوی قوم کی حمایت کرتی رہی وغیرہ وغیرہ۔عورت ناقص العقل ہے اسکی گواہی بھی مرد کی آدھی گواہی کے برابر ہے......'' مجھے بعد میں معلوم ہوا......کہ مکھن دین صاحب کی بیوی انہیں چھوڑ بھاگ چکی تھی ورنہ وہ عورتوں کے ازلی دشمن نہ تھے۔وہ ابھی تانبے کی گھنٹی کی طرح بج ہی رہا تھا کہ اسکی بات کاٹ



کر......

چادر پوش ریٹائرڈ صوبیدار'' بول اٹھا: ''مجھے ایک بات یاد آ گئی ہے سجنو۔سب سے مخاطب ہو کر بولے: ''جب میں نے اپنی داڑھی حجر اسود سے چھوئی تھی تو تو عہد کیا اے حجر اسود تم گواہ رہنا'' اسکے بعد میں مرتے دم تک اپنی داڑھی نہیں کٹواں گا'' حجر اسود جنتی پتھر ہے یقیناً میں جنت میں جاوں گا......''

اس نے اپنی داڑھی سب کو دکھا دکھا کر کہا:

''لوگو تم سب اس بات پر گواہ رہنا'' محفل میں رقت طاری ہوگئی......گویا وہ خاموش ٹیلوں کی طرح تھے کوئی پرندہ بھی کہیں پر بھی نہیں مار رہا تھا......

ادھر مولوی صاحب اٹھے

مولوی صاحب نے مکھن دین صاحب کو مخاطب کر کے کہا: ''پیغمبروں کا نام ادب سے لینا چاہیئے تھا وہ سب کے سب معصوم عن الخطا تھے......''

خیر اسی اثنا میں کسی نے کہا ہاتھ دھولیں۔کھانا تیار ہے......اگلے چند لمحوں میں سب خواص وعوام کھانا کھا چکے تھے اور منشی نجم الدین جو زندگی بھر سود بیاج لیتے رہے لیکن آج تائب ہو چکے تھے۔اسی توبہ کے اعلان کے لئے اس دعوت خاص کا اہتمام کیا تھا۔چنانچہ منشی نجم الدین نے اعلان کیا لوگو۔تم سب گواہ رہنا میں نے سود لینا دینا چھوڑ دیا ہے لیکن میرے مقروضوں کو پچھلا حساب تو چکانا ہی پڑے گا۔ہاں پچھلا حساب

# شربتی کی روح

(افسانہ)

حسن خداداد ایسی چیز ہے کہ جس کو کم سن بچہ بھی دیکھ سکتا ہے۔اور اسکے برعکس عیب یا نقص یا قبح ایسی شی ہے کہ دولت کی دبیز چادر اوڑھ کر بھی اسے چھپایا نہیں جا سکتا ہے۔میں لڑکپن کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔اگر چہ میں کتابی کیڑا تھا لیکن جب کبھی گھبراہٹ محسوس ہوتی تو وہ سی پارہ ہی ہاتھ میں کیوں نہ ہوتا......تو میں اسے الٹا رکھ کر عام لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہو جایا کرتا تھا۔اور پھر ان دنوں وہ دیر تک گلی ڈنڈا کھیلنا۔ بہتے ہوئے آب مصففا کے دھاروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا......درمیانہ اونچے درختوں پر چڑھنا انکی چوٹیوں پر بیٹھ کر انہیں ہلانا اور اور خود ہلورے کھانا......کوئی مضبوط سی کھلی اور لمبی شاخ دیکھی تو جنگلی بیلوں کو رسا بنا کر اس پر جھولا تیار کر لینا یا پھر تادیر پست اور لمبی شاخوں پر بوزنوں کی طرح کھیلنا۔میری عمر کا کتنا خوبصورت عہد تھا وہ......روٹی کسی کے مغز سے نکلتی تھی پڑھائی کا خرچہ کم ہی ملتا تھا لیکن کسی کی جیب سے...... ماں کی شفقت نے کبھی بھوکا نہیں رہنے دیا۔خدا ہی جانتا ہے ہمارا پیٹ بھرنے کے چکر میں وہ خود کتنی بار بھوکی رہی ہوگی......خیر

یہ وہ دور تھا جب نسوانی حسن کا...... مجھے اچھی طرح احساس ہونے لگا تھا......شربتی جو اپنی پوری جوانی میں تھی مجھ کو خوبصورت ترین عورت دکھائی دی۔اسکی عمر یہی کوئی



اٹھارہ برس تھی۔اسکے حسن کے چمن کے بارہ میں صرف اتنا کہوں گا......

چمن تھا معرفت کا ایک دفتر
چمن میں بولتا سچا خدا تھا
(غنی)

گاؤں کی باولی پر ایک بار میرا گزر ہوا مجھے نہیں معلوم تھا کہ صبح صادق کے وقت اس باولی میں چودھویں کا چاند اتر آیا تھا......میری نظریں خیرہ ہوگئیں۔ایک لمحے کے بعد دیکھا کہ اس نے اپنے لمبے بالوں سے پورا جسم ڈھانپ لیا تھا۔البتہ شب تار جیسے بالوں میں کہیں کہیں سے اسکے اعضا کی روشنی اس طرح پھوٹ رہی تھی۔جس طرح کہ راہگیروں کے پھٹے ہوئے کالے خیموں کے بیچ میں واقع سوراخوں سے رات کو جلتے الاو کی روشنی باہر آتی ہے......

اس کا گورا بدن، چمکتے ہوئے چہرہ پر تلوار جیسی آبدار ناک میں سونے کے تیلی کا منظر ہزاروں سال کے بعد طلوع ہونے والے ستارے جیسا تھا...... تنے ہوئی کمان جیس پلکیں......اسکی آنکھیں گویا بیت مقدس کے محرابوں میں رکھے ہوئی دو نوری دئے تھے یا پھر تسنیم و کوثر سے بھرے ہوئے دو پیالے......سچ مچ ان سے تو سوم رس کے جیسا خمار، جسے صدیوں کی ریاضت سے جوگی جنگم حاصل کرتے ہیں۔مجھے بھی ٹپکتا دکھائی دیا۔صراحی جیسی اسکی گردن سر کے بوجھ کے لیے موزوں تھی لیکن پانی سے بھرے بھاری مٹکے اٹھانے کے لئے نہیں تھی...... ماہ نو جیسی کانوں کی لوئیں۔لیکن انکے لئے سونے چاندی بالیاں میسر نہیں تھیں لہذا پیتل کے کیل پہنے تھے۔فراخ پیشانی کہکشاں جیسی مانگ......اعضا الگ الگ تھے اپنی تفصیل خوبصورتی سے بیان کر رہے تھے نہ کہ بھدی عورتوں کی طرح بھم خلط ملط ہو چکے تھے وہ حسن قدرت کا جیتا جاگتا پیکر......اللہ اللہ۔

کیمرے کی فلیش کی طرح میں پیچھے ہٹ گیا جلد ہی اس نے غسل کر کے میلے کچیلے کپڑے پہن لئے گویا چاند بادلوں کی اوٹ میں تو نہیں چلا گیا تھا البتہ انکی زد پر ضرور تھا......

قسمت کے کھیل دیکھیے اس کی شادی ایک کوتاہ قد اور بھدے شخص سے ہوئی تھی۔اس کے بھدے پن کی اگر منظر کشی کروں تو مجھے صفحہ کاغذ بار گراں تلے دبنے کا شکوہ کرے گا اور مجھے ڈر ہے کہ میرا قلم فرشتہ علم ودانش یعنی روح قدس سے ناانصافی کی اپیل نہ کر دے۔البتہ

سر پچکا ہوا پیشانی اور ماتھا باہم ملتے ملتے رہ گئے تھے بیچ میں کوئی ایک آدھ انگل کا فاصلہ تھا سر چھوٹا اور کان بڑے بڑے۔پتہ نہیں یہ بوزنے کی نسل،عورت کی کوکھ سے کس طرح پیدا ہوا تھا؟ مجھے الجھن بنی رہتی تھی تاہم معمہ حل نہ ہو سکا ہے ابھی تک۔

چہرہ خدا نے بنایا تھا اسکی صنعت سے نفرت نہیں کرتا وہ جیسا کیسا ہے لیکن لقوے کی وجہ سے دائیں ہونٹ دائیں گال کے بیچ پیوست ہو چکا عیاں ہے......اسکی ناک بھی قدرت کی صنعت سہی لیکن ذوق خداداد کی قسم وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دائیں کندھے کو سلامی کر رہی ہے۔

جسم مضبوط لیکن بھالو جیسی جلد اور موٹے بالوں سے پر......بالوں کی وہ بہتات کہ اسکے بدن کے کھلے حصوں پر رائی رکھنے کو خالی جگہ نہ ملتی ہے......

غلیظ کپڑے،سر کا چھوٹا پن چھپانے کے لئے بڑی سی پگڑی پہنتا ہے......مجھے پہلی بار یقین آیا کہ پریاں جنوں کے قبضے میں ہی ہوتی ہیں......ایسا منحوس کہ اگر صبح کو کوئی اس کا منہ دیکھ لے تو دن بھر کھانا نہیں ملتا......

اس بھدے شخص کی عادتیں اور خصلتیں اس کی شکل وصورت سے کہیں زیادہ بری اور بھدی تھیں......



وہ شربتی کو شک کی نیت سے دیکھتا اسکی عمر بھی زیادہ تھی لیکن شیکسپئر کے میک بتھ جتنی نہیں تھی۔نفسیاتی مریض ہی تھا قسمت سے زیادہ دولت کیا ملی کہ ناشکری میں مبتلا ہوا......آئے دن اسے ستانا مارنا پیٹنا شربتی کے شوہر رشیدے کا روزمرہ کا معمول تھا......بدنام زمانہ رشیدے کا نام سنتے ہی عورتوں کو ابکائی آجاتی تھی......

میں نے بارہا دیکھا کہ شربتی کے روئی کے گولوں جیسے گالوں پر سے موٹے موٹے آنسو بلوروں کی ڈھلکتے رہتے تھے......اس کا کوئی حمایتی نہیں تھا ماں باپ بہن بھائی دور دراز پہاڑوں پر رہتے تھے۔اسکے درد کی لپٹیں فقط اسی کو جلاتی رہتی تھیں حتی کہ اسکے چہرے پہ سیاہ نشان نمایاں ہونے لگے تھے۔اور خوبصوت خدوخال آنسوؤں سے دھل دھل کر رنگ پریدہ تصویر یا کرم خوردہ کتاب کا منظر پیش کرتے تھے......دو بچوں کی ماں ہو چکی تھی کمزوری کی حالت میں تیسری بار حاملہ تھی اور وضع حمل کے دوران ہی کوچ کر گئی۔

جلد ہی رشیدے نے دوسری شادی کر لی اور شربتی کے شکم سے پیدا ہوئے دو بچے ظلم وستم کی چکی کے دو پاٹوں میں تھے......ایک نوعمری میں پہاڑ سے گر کر مر گیا اور دوسرا اس طرح لاپتہ ہو گیا......کہ آج تک اسکی خبر نہیں ملی۔ظالم آج ستر سال کی عمر ویسا ہی ہٹا کٹا ہے۔ناگ کی طرح اپنے بچوں کو اس نے کھا لیا......سوچتا ہوں پچھلے چالیس سالوں میں شربتی کی ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی۔

سنا تو تھا کہ ظلم کی ٹہنی پھلتی نہیں لیکن دنیا میں اسکے خلاف ہی ہوتا ہے یہاں تو ظلم کی ٹہنی کئی لڑوں والا ایسا درخت بن چکی ہے کہ جس کے زہریلے پھلوں سے آج بھی گاؤں کی فضا آلودہ ہو رہی ہے......اور شربتی کی روح پرندوں کی شکل میں اپنے بچوں کی قبروں پر اگے نرگس کے پھولوں کو دیکھنے آتی تو ہو گی لیکن اس زہریلے درخت سے کترا کے ہی گزرتی ہو گی۔اور پھر نیلی جھیل کے کنارے بید مجنوں کے درختوں کے جھنڈ کی طرف لوٹ جاتی ہو گی......ہاں شربتی کی روح......

# کینکر وارمز

(افسانہ)

بس اسٹاپ پر ایک ہجوم کے بیچ میں کھڑا خالد اپنی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔کئی گاڑیاں آتی تھیں اور اپنے اپنے مسافروں کو لے کر منزل کی طرف چلی جاتی تھی۔بس اسٹنڈ شہر کی زندگی کا حقیقی منظر پیش کرر ہا تھا جہاں ہر آدمی کو اپنی اپنی فکر تھی۔مسافروں کی تعداد بہت زیادہ تھی کیونکہ پچھلے دوز روز تعطیل تھی...... ہر کسی کو اپنی اپنی ڈیوٹی یا کالج میں وقت پر پہنچنا تھا۔

بالاخر ہرے رنگ کی مخصوص دھاریوں والی گاڑی جو کہ ایگریکلچر یونیورسٹی کی تھی آن پہنچی۔سبھی لڑکے لڑکیاں اس میں سوار ہوگئے۔حسن اتفاق سے خالد کے پاس زہرا آن بیٹھی تھی۔

زہرا نے اسی سال کچھ دن پہلے خالد کے Batch کیساتھ داخلہ لیا تھا خالد ہر روز اسکی جانب محبت سے دیکھتا تو رہتا تھا لیکن کبھی اظہار کی جرأت نہ کر سکا تھا......اسکے خیال میں اسکو موقع ہی نہ ملا تھا۔

ویسے تو ہوشیار لوگ ہر قسم کے برے اور نا مساعد حالات میں اپنے لئے کسی نہ کسی طرح کوئی موقع محل ضرور بنا لیتے ہیں۔جبکہ کاہل اور سست لوگ تقدیر اور حالات کے بھروسے پر کسی اتفاقیہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تا کہ اسکے پاتے ہی وہ اپنا تیر ہدف



پر لگائیں......خالد خوش تھا کیونکہ آج اسکے ساتھ والی سیٹ پر اسکے خوابوں کی ملکہ یعنی زہرا آن بیٹھی تھی......وہ سمجھتا تھا کہ قسمت نے اسے یہ موقع فراہم کیا ہے اور وہ اسے اچھا شگون سمجھ رہا تھا......طرح طرح کی خوابیں سجا رہا تھا......پھر جسارت کر کے اس نے روایتی انداز میں بات چھیڑی......

زہرا۔ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہماری سیلکیشن ایک ساتھ ایک ہی کالج میں ہوئی ہے۔خالد گاڑھی کی کھڑکی سے باہر جھیل میں اگے ہوئے کنول دیکھ رہا تھا......اس وقت زھرا نے خالد کی یہ بات سن کر مسکرا دیا اور اس نے پھولوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔بلکہ وہ دوسری جانب دیکھنے لگ گئی......جب انکی بس ایک عظیم درگاہ کے قریب سے گزری تو دونوں نے اس کو عقیدت کی نظر سے دیکھا گویا اس مقدس زیارت کا مرمریں گنبد پہلا مقام تھا جہاں چند لمحوں کے لئے انکی نظریں باہم ٹکرائیں یا ملیں تھی۔خالد خوش ہو رہا تھا جب کہ زہرا نے اپنی عقیدت بھری نظر پر کوئی ردعمل نہیں ظاہر کیا۔اگلے تھوڑے لمحوں کے بعد بس ایگریکلچر یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھی۔زہرا نے کہا اچھا خالد میں چلتی ہوں۔

خالد نے گھبرا کر کہا آپ نے کلاس نہیں اٹینڈ کرنی۔

زہرا نے کہا۔پرمسرت اور فخر آمیز لہجے میں اس نے کہا۔

میری سیلکشن میڈیکل کالج میں بھی ہو چکی ہے......میں آج اپنی اصلی دستاویزات واپس لینے آئی ہوں......تمہارے ساتھ کلاس ایٹنڈ کرنے نہیں آئی۔

زہرا کی باتیں سنکر خالد کو زبردست دھچکا لگا وہ گویا ساتویں آسماں سے اتر کر زمیں پر رینگ رہا تھا بلکہ پاؤں کے نیچے سے زمیں بھی اسکو کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے بعد زندگی بھر اسکے دماغ میں Gazania flower یعنی گزانیا کے پھول چھائے رہے جنکی زندگی ایک دن ہوتی ہے۔صبح کو کھلتے ہیں اور شام کو انکی جگہ چینٹے ہی چینٹے رہ جاتے ہیں کینکر وارمز یعنی cankerworms۔

# دو مفرور لڑکے

(افسانہ)

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے مجھ کو بھی آوارگی کا شوق چڑھا......تو میں بھی گھر سے بھاگ نکلا تھا......اس دوران مجھے ہواؤں میں اڑنے والے پر کی طرح کئی مقامات سے گزرنا پڑا...... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن میں اپنے ہی جیسے ایک مفرور لڑکے سے ملا......لڑکا کیا تھا یہی کچھ پندرہ سال کا......ابھی اسکے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے لیکن چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

میں اس سے مخاطب ہونے والا ہی تھا کہ ایک اور اچھے بھلے اور تنگڑے لڑکے نے بھیک کا کشکول آگے بڑھایا۔ مجھے اسکی حالت پر رحم آگیا اور میں نے اسے پیٹنا شروع کر دیا......جب میں اسے پیٹتے پیٹتے تھک گیا اور اس نے معافی مانگی کہ آئندہ تجھ جیسے قہار و جبار سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ مزید اپنی جان بخشی کی اپیل کی تو میں نے اسے مارنا بند کیا......اس نے روتے ہوئے الحاح وزاری سے جب یہ کہا: ''تم بھی خدا یا بھگوان سے کم نہیں ہو۔؟''

مجھے اسکی بات پر ہنسی آگئی......

میں نے اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا میں تیرا دشمن نہیں بلکہ سچا ہمدرد ہوں اور میں نے اسکو یہ کہہ کر سمجھایا......''جاؤ اور جا کر محنت کرو۔'' آنسو پوچھتے ہوئے اس نے کہا ٹھیک



ہے۔ محبّ و مخلص جان کر وہ لڑکا بھی مجھ سے ناراض نہ ہوا۔

ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے اس لڑکے نے کہا: ''میں مزدوری کروں گا۔''

میں نے کہا بہتر ہے لیکن مزدوری ٹھیکے پر کیا کرنا۔ یہ سنتے ہی وہ مجھ کو داغِ غم دے کر رخصت ہو گیا۔ اور جاتے ہوئے دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا......ناگاہ۔ میری شفقت پھر کچھ مہینوں کے بعد اسے میرے پاس کھینچ لائی اور میں نے دیکھا کہ تبھی وہ ترقی کر کیا اچھا ٹھیکیدار بن چکا تھا۔ اور مجھ سے وہ پوچھنے لگا آخر تم ہو کون؟

میں نے کہا تم مجھے اپنا باپ ہی سمجھ لو۔ ان جھگیوں کے پیچھے بڑی حویلی کے سیدھا اوپر والی منزل میں رہتا ہوں......کئی سال پہلے تیری کچرا اٹھانے والی ماں مجھ سے......فقط مجھ سے ملا کرتی تھی......لیکن وہ لڑکا بولا ''میں تو یتیم خانے میں پلا ہوں......لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے کوئی عورت وہاں پھینک گئی تھی......'' میں نے کہا کہ لوگ اس یتیم خانہ کا نگران اعلےٰ لوگ مجھے ہی کو کہتے ہیں......خیر

میری توجہ کا مرکز اسکے علاوہ دوسرا مفرور لڑکا تھا جو نحیف و نزار خاکی کپڑے پہنے ہوئے بوڑھ کے درخت کے نیچے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو گھر سے کیوں بھاگا ہوا ہے؟ اس نے کہا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟

میں نے کہا میں تیری طرح مفرور ہوں۔ عمر میں بہت بڑا ہوں مجھے مشفق و مہربان ہی سمجھو۔ ہمدردی کی کشش اسے میرے قریب کھینچ لائی۔ اس نے ویسا ہی سوال پوچھا آخر تم ہو کون؟ میں نے کہا آدمی ہی سمجھو لیکن ہوں نہیں۔ اس مفرور لڑکے نے دوبارہ پوچھا تو پھر تم کون ہو؟

میں نے کہا کچھ بھی سمجھو......

لیکن اس وقت تیرے خیال کے مطابق متشکل ہوں......وہ میری فلسفیانہ بات کو سمجھ نہ سکا۔ لہذا اس نے اپنا سر کھجایا اور پھر وہی عام سی وجہ بتائی۔ جو ہر بگھوڑا لڑکا بتاتا

ہے۔ وجہہ کچھ اسی قسم کی تھی جیسا کہ اکثر والدین کی غربت و لاچاری کئی قسم کے قہر یا غصے کا روپ میں انکی فالتو اولاد پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہاں ایسی ہی اولاد پر جو انکی لذت کی تکمیل کے بعد مفت میں گلے پڑی ہوئی ہوتی ہے......اسکے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ اپنے مزدور ماں باپ کی بارہویں اولاد تھی۔ اسکے ماں باپ انکی کثرت سے ڈر کر انہیں چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ گئے تھے......وہ بارہ بھائی بہن کتے کے پلوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور پھر کبھی ایک دوسرے سے مل ہی نہ سکے اور ملتے بھی کیسے اور کیوں؟

انہیں شدید افلاس اور بھوک پیاس کی حالت میں صرف اپنا آپ ہی پالنا تھا......کچھ گرا پڑا ملا تو کھا لیا نہیں تو امیر لوگوں کے بچوں سے سے دھکے مکے ہی کھا لیا کرتے......خیر

اپنے ہی جیسا آوارہ مگر ہمدرد سمجھ کر۔ میں نے اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اسنے بھی مجھ پر اعتماد کر لیا۔ اور ہم دونوں سڑک پر چلنے لگے......پھر کیا ہوا کہ میں اچانک ہوا میں اڑنے لگے اور اس لڑکے نے بھی میرا ہاتھ پکڑ لیا الغرض وہ بھی میرے سہارے کچھ دیر اڑتا رہا۔ لیکن اسکو ساتھ لے کر اڑنے میں مجھے سخت دشواری محسوس ہوئی۔ کیونکہ دیوتاؤں یا خداؤں کی طرح اکیلا ہی اڑنے پر قدرت رکھتا تھا لہذا میں اس زمینی پیداوار کے بوجھ کو کہاں تک ڈھوتا......یا پھر اٹھا کر اڑتا......آخر ہم دونوں زمیں پر اتر گئے......میں اس سے پیچھا چھڑانا کے لئے آخری سوال کیا۔ اے مفرور لڑکے تجھے آخر جانا کہاں ہے اور کس کی تلاش ہے......

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیا نظر آتا ہے" غور سے میری پتلیوں میں دیکھو۔" میں نے جواب دیا" تم میری آنکھوں کی پتلیوں میں کیا دیکھ رہے ہو۔"



جواب ندارد

میں بھی کچھ نہیں بولا۔ اس نے معصومی سے کہا:

"میں خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں"

میں نے کہا:

سنا تو یہ تھا کہ خدا ہر وقت ہر آدمی کے پاس اسکی شہ رگ سے بھی قریب موجود ہوتا ہے۔ اس نے کہا:

"میں بھی تو کمان کے دونوں کونوں سے بھی کچھ کم فاصلے پر آپکے سامنے موجود ہوں......"

یہ سب کہتے اور دیکھتے ہوئے اسکو کچھ سمجھ نہیں آیا۔

اس نے پھر معصوم لہجے میں سوال کیا۔

خدا رہتا کہاں ہے اسکی پہچان کیا ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا دنیا میں تین کروڑ بیس لاکھ خدائی تصور مختلف حوالوں میں ملتے ہیں......

تم کو کس کس خطے کے لوگوں کے خدا سے ملواؤں۔ سنو

کچھ لوگوں نے سیاہ فام عورت جسکی اندام نہانی سے پھولتی ہوئی شاخ نکلتے دکھائی گئی ہے کو ہی اپنا خدا سمجھا۔

کچھ لوگوں نے ایسی کالی عورت جسکی زبان سرخ شعلے جیسی ہے یا پھر خون سے لتھڑی ہوئی دکھائی جاتی ہے کو خدا کا روپ سمجھا۔

کچھ لوگوں نے انسانی خوشنما بدن پر ہاتھی یا گھوڑے یا بیل یا گائے یا مینڈھے یا گھوڑے، بلی یا گینڈے کے سر کو رکھ کر خدائی تصور باندھا۔

بعض لوگوں نے خدا کے تصوراتی علاقے پھولوں درختوں پہاڑوں دریاوں اور مخصوص جگہوں کے علاوہ چٹانوں یا پتھروں سے بھی ملائے۔

افریقہ کے صحرائی بدوؤں نے خدا کو مرد مجرد بتایا اسکو ساعت بینائی عقل کلی جیسی صفات سے متصف کیا۔ اور اسکے دوٹھکانے بتائے ایک آسمان پر۔ اور دوسرا زمیں پر کبھی تو انکا خدا خلائی راکٹ کی طرح آسمانوں میں صعود کرتا ہے اور کبھی طیارے کی طرح وہ زمینی پلیٹفارم پر نزول بھی کرتا ہے......

یہی ستم ظریفی نہیں بلکہ اس کو پتھر سے بنائی گئی مضبوط کوٹھڑی میں قید بھی کرنا چاہا۔ لیکن......

لیکن......خدا خدا تھا اس نے راہ فرار ڈھونڈ نکالی...... وہ لوگوں کے داموں سے ٹائنی مچھلی کی طرح نکلتا رہا۔ اور کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔

آگے کچھ کہتے کہتے میں رگ گیا

وہ لڑکا سادگی سے کہنے لگا۔ مجھے لگتا ہے وہ بھی ہماری طرح مفرور ہے۔ میں نے کہا وہ کیوں بھاگے گا؟

لڑکا کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور بولا وہ بڑا مجرم ہے جس نے اربوں کھربوں مخلوق مع انسان پیدا کئے۔ جب اتنے لوگوں کی کفالت کا بوجھ تو اس سے اٹھایا نہیں گیا۔ تو ایسی صورت میں پھر اس کا فرار ہونا طے تھا۔

پکا۔ پکا......سر ہلا کر بار بار کہہ رہا تھا......

''وہ بھی ہماری طرح مفرور بلکہ روپوش ہو چکا ہے۔'' یہ سن کر، ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

آنکھ کھلی تو میں تنہا اپنے بستر پر آنکھیں مل رہا تھا۔ اور ان دو مفرور لڑکوں کے دھندلے سے خاکے میرے دماغ کے خلیوں میں تھے جنہیں میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اور شاید نہ ہی کبھی آئندہ دیکھوں گا بھی۔

دو مفرور لڑکے



# سرمد کا قتل: صوفی کی موت

(کہانی)

سرمد غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمری باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

اے سرمد، غمِ عشق کسی بوالہوس کو نہیں دیا جاتا۔ پروانے کے دل کا سوز کسی دسترخوان کی حریص مکھی کو نہیں دیا جاتا۔ عمریں گزر جاتی ہیں اور پھر کہیں جا کر یار کا وصال نصیب ہوتا ہے، یہ سرمدی اور دائمی دولت ہر کسی کو نہیں دی جاتی۔

ہم سبھی سبزہ کی مانند ہیں اور تو میٹھا پانی
ہم پیڑ پودے ہیں اور تو پھول خوشبو اور پھل
ہم مٹی ہیں اور تو اس میں اگنے والا سدا بہار باغ
ہم آہوئے تاتار ہیں اور تو مشک نافہ

خدا ہمارے جسم کے اندر ہے لیکن ہم اس کی تلاش میں اپنے جسم سے باہر سرگرداں...... برہنگی ہی سرمد کا قدرتی اور فطری لباس تھا......یہ کاشانی مرد شکل و صورت اور سیرت وشمائل کے اعتبار سے طرفہ روزگار تھا...... ''ص'' جیسی آنکھیں ''ل''

جیسے زلفوں کے کنڈل ''ط'' جیسے کان ''ن'' جیسا منہ......اللہ کے الف سا چھریرا بدن جب وہ گویا ہوتا تو یوں لگتا گویا صفوں پر مشک وگلاب چھڑک رہا ہے۔اس کا خیال تھا کہ ہرانسان کامل اللہ کا نشان ہے،، ورنہ تو خدا صرف کہنے کوایک لفظ ہے۔اسطرح عوام انکے عالموں سے منطقی اعتبار سے بہتر تھی......اسکے مطابق۔

کائنات ساری ہی قران ہے۔مخلوقات خدا اسکی آیات ہے۔انسان قران ناطق ہے وغیرہ کائنات پرغوروفکر ہی قرآن حقیقی کا مطالعہ ہےاورعلم حقیقی تحقیق کائنات ہے غوروفکر کرنے والے ہی دنیا کے سچے وارث ہیں۔

عالم لاہوت کا یہ طائر...... ہمیشہ لذت فکروذکر کو ہی موضوعِ بحث بناتا اور خدا کی روایتی تعریف نہیں کرتا...... جہاں وضوواستنجا سے بات شروع ہوتی اور رسمی اداکاری پر ختم ہوجاتی ہے......اس کوخدا کوکسی ایک طرف نہیں دکھاتا بلکہ ہرطرف ہر چیز میں موجود بتاتا تھا......وہ چڑھتے اورلہندے کی روایتوں کا قایل بھی نہ تھا......

کسی زوال کیا اقبال کی گھڑی بھی قایل نہیں تھا۔عبادت کوکوئی وقت نہیں حقیقی عبادت صلاۃ دایمی ہے...... ہمہ وقتی نماز ہی ادا کرنے میں مصرف رہتا تھا......وہ شبلی وقت تھا وہ بایزیدصفت وہ حلاج کے روایت کو پروان چڑھانے والا اوہ دولت اویس قرنی کا ترجمان تھا......

وہ تخیل کے سمندورں میں فکر کی انگلیاں بھگوکر اپنے ہی دل ودماغ کی ضخیم ترین کتاب کے لاتعداداوراق پلٹتا رہتا تھا۔اوراسکے ہرورق پر ''لا الہ'' لکھا ہوا پاتا تھا اوریہی اسکی تلاوت اور وردِ مقبول تھا۔وہ جب خدا کے احسانات کوجب یاد کرتا تو اسکی آنکھیں فرط محبت کے باعث برسات میں بھیگنے والے چٹانوں کی طرح ٹپ ٹپ کرنے لگتیں......

خدا کی رحمت جو ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے یہ تصور کر کے جب وہ



اپنے جسمِ لطیفِ خیالی سے اڑنے لگتا اور ہواؤں پر مصلیٰ بچھا کرشش جہات میں پھیلی ہوئی لامحدودیت پر......زور زور سے ''لاالہ'' پکارتا تو اس وقت ہر مقدس تسبیح ٹوٹ کر اسکے منکے آسمانوں میں ستاروں کی طرح بکھر جاتے،اورنور بکھیرنے لگتے۔وہ روایتی صوفی نہیں تھا اس لئے وہ ابرنیساں کو پیغامِ محبت سمجھتا تھا، جوخوک وماہی سے لیکر رندو عارف پر یکساں برستا ہے۔اسکے نزدیک عارف کا وجود دریا اور سورج ہی جیسا تھا فیض رسانی ہی کو اصلی جوہرعبادت سمجھتا تھا...... جب وہ باغوں سے گزرتا تو دیدہ زیب پھول اسکو کوالوہی،تخیل کی پریاں یا حورعین دکھائی دیتے تھے......وہ انسان کامل کو زمینوں کا سکون آسمانوں کی بلندی کا باعث سمجھتا تھا،خدا کے بندوں کے دسترخوان پر ہرمورو ملخ سب کا حق برابر ہے،اسی لئے انکے دروازے بغیر کسی امتیاز ہرکسی کے لئے کھلے رہتے ہیں......کبھی کبھار وہ سوچتا یہاں یہ چھینا جھپٹی کیوں ہے یہ دربان اورنگہبان کہاں سے آگئے؟......پھر جب کبھی وہ ورطۂ حیرت سے باہر نکلتا۔سرسبز اور شاداب وادیوں سے گزرتا اور پھولوں پر منڈلاتی ہوئی تتلی کی طرف اشارہ کر کے کہتا وہ دیکھو، خدا کی آیت اڑتی ہوئی جارہی ہے۔اسے سدابہار پودوں کے پتے کتاب معرفت کے ورق دکھائی دیتے تھے جن پرمحبت وحدت وکثرت لکھی ہوئی دکھائی دیتی......وہ چلتا تو پرندے اس کے سر کو شجرطوبی سمجھ کر طواف کرتے جانوراپنے سروں کو نیوڑھاتے،ڈھور ڈنگر وحوش ودرندے صف بہ صف اسے سلامی دیتے رہتے......خدا کی ننھی مخلوق کیٹ پتنگے اس چراغ خرد پر منڈلامنڈلا کر اپنی جانیں نچھاور کرتے رہتے۔

پہلی اورآخری بار۔ایک لڑکا اسکی محفل میں استقلال اورشان سے......صفیں چیرتا ہوا داخل ہوا اور سیدھا اسکے پاس پہنچا۔اسے دیکھتے ہی سرمد اٹھ کھڑا ہوا۔اور پھر اس پر پراک غنودگی طاری ہوگئی جب آنکھ کھلی تھے تو اس کا ہاتھ اک حسین لڑکے ''ابھئے چند'' کے ہاتھ میں تھا،تھوڑے ہی عرصہ بعدسرمد ملاؤں کے ایما پر قتل کردیا گیا تھا......

# پنجرے کا قیدی

(افسانہ)

ہمارے سماج میں عورت کی حثیت آرائشی گملے جیسی ہے......گل بانو کو یہ راز معلوم نہ تھا......

گل بانو ایک حسین وجمیل عورت تھی کھاتے پیتے گھر میں بڑی ناز سے پالی گئی تھی۔وہ گاؤں کے بڑے چوہدری کی بیٹی تھی......

وہ ایم فیل کی ڈگری حاصل کرچکی تھی......اس نے محکمہ تعلیم میں ایسٹنٹ پروفیسر بننے کے لئے فارم بھرا ہوا تھا اور مزید پی ایچ ڈی کی تیاری کررہی تھی۔نجانے کیوں؟

اسکے والدین کو اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ گل بانو کے بارہ میں دل ہی دل میں لگاتار خوف لاحق رہتا تھا......جب وہ شہر سے واپس آتے ہوئے تھوڑی لیٹ ہوجاتی تو ان کا چین اڑن چھو ہوجاتا۔جب تک وہ گھر نہ پہنچتی والدین جو بزرگ ہوچکے تھے سخت بےچین رہتے۔انکا اکلوتا بھائی کنیڈا میں شہریت حاصل کرچکا تھا اور یہ خاندان جموں سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا......ان حالات کے پیش نظر......

گل بانو کے والدین کی اس بڑھتی ہوئی تشویش کا واحد علاج اسکی شادی تھی وہ گھر جمائی لانا چاہتا تھا لیکن کفو کے مطابق جب معقول ومناسب رشتہ نہ مل سکا۔تو ایک



خانزادے افضل سے اسکا رشتہ طے کردیا......لیکن اس نے گھر جمائی رہنے کی شرط نہ مانی......بڑی حویلی کا مالک تھا نوکر چاکر گاڑیوں کی ریل پیل رہتی تھی۔اور اسکا باپ منسٹر تھا لیکن وہ خود نیم پڑھا لکھا تھا......بچپن سے غلط سوسائٹی میں رہ رہ کر اسے کئی بری عادتیں پڑ چکی تھیں نشہ بھی کرلیتا تھا اور آگے پیچھے عیاشی بھی۔گل بانو اپنے ہونے والے شوہر کے عیبوں سے بے خبر تھی۔گل بانو کے والدین چاہتے تھے کہ شادی جلد از جلد ہوجائے۔

لہذا شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔گل بانو کی رہائش اب بڑی حویلی دوسری منزل پر تجویز کی گئی تھی۔پہلی بار جب گل بانو اس حویلی کی خوبصورت اور مزین سیڑیاں چڑھ رہی تھی تو اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔کیونکہ اس خیال تھا کہ وہ ان زینوں سے جس طرح اوپر جارہی تھی اسی طرح نیچے بھی آیا کرے گی لیکن شادی کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس حویلی کے زینے خالی اوپر چڑھتے تھے اور نیچے اترنے کے لئے نہیں تھے......اسکے خانزادے شوہر کو اسکے لئے وقت ہی نہیں تھا......خود تو زیادہ تر گھر سے باہر گل چھرے اڑاتا رہتا تھا۔گل بانو پر گھر میں ہی رہنے کی مکمل پابندی عائد کردی گئی تھی......اسے شوہر کی رفاقت کے علاوہ چاردیواری کے اندر ہر چیز میسر تھی اسی لیے وہ بیشمار اندیشوں میں گھری رہتی تھی۔والدین سے دوری اور شوہر کا ناروا سلوک اسکے دل کا ناسور بنتا جارہا تھا۔اسے بار بار محسوس ہورہا تھا کہ اس کے حسیں خواب اسکی آبرو کے ساتھ ہی لٹ چکے ہیں۔اور اب وہ اس بڑی حویلی یعنی حسیں پنجرے کی قیدی بن چکی ہے۔

# پنڈت کیلا رام

(کہانی)

مشہور مقولہ ہے کہ دنیا میں جب تک بھیڑیں پائی جائیں گی تب تک بھیڑیوں کا پایا جانا بھی یقینی اور بدیہی امر ہے اسی طرح جب تک غلامی کا ذوق رکھنے والے جہلا دنیا میں موجود ہیں انکے آقاؤں کو بھی موت نہیں آسکتی...... جہالت اور انپڑھتا کا رسموں اور توہم پرستی سے گہرا رشتہ ہے۔

وہ پرانے شہر میں گلی کی نکڑ پر ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھا کرتا تھا۔ پنڈت کیلا رام کا سوکھا سڑا ہوا جسم، کمان کی طرح جھکی ہوئی کمر، رنگ جو کبھی گورا ہوا کرتا تھا، بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے پیلا پڑ چکا تھا......سر پر پیلا سافہ باندھتا تھا اور زعفرانی کرتا پاجامہ......اسکا یہ پیلا لباس اسکے کمزور جسم کے پیلے پن کو مزید پیلا بنا دیتا تھا۔ گویا پنڈت جی سر بسر پکے ہوئے چھوٹے کیلے کی طرح دکھائی دیتے تھے......

میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو مجھے وہ ہڈیوں کی مٹھی نظر آیا۔ اسکے جسم پر گوشت تھا ہی نہیں ہلدی کی ''مرجیوڑی گنڈی'' جیسا دکھائی دیا تھا۔ بہر حال

پنڈت کیلا رام انسان دوستی اور بھائی چارہ کی ایک مثال تھا۔ ہندو مسلمان سکھ ہر کوئی اسکے پاس جاتا تھا......جادوٹونے کرانے کے لئے یا پھر انکا علاج کرانے کے



لئے بھی۔ سائکوتھراپی کے عمل کے تحت کچھ لوگوں کو فائدہ بھی ہوتا تھا۔

اسکے زائرین میں زیادہ تر ضعیف الاعتقاد گنوار دیہاتی عورتیں ہوا کرتی تھیں...... مرد بھی اکا دکا نظر آہی جاتے تھے مگر زیادہ تر عورتیں ہوا کرتی تھیں۔

گویا اسکا کمرہ ہمیشہ عورتوں کی مہک سے جاگتا رہتا تھا......

کیلا رام کے بارہ میں کہا جاتا ہے اس نے بھوتوں کو قبضے میں کیا ہوا تھا......لہذا عام لوگ ڈر کر بھی اس کی عزت کرتے تھے......

کہا جاتا ہے ایک بار کوئی دیہاتی بچہ جو اپنی ماں کے ساتھ کیلا رام کے پاس آیا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی اسکے پاس رکھی ہوئی شیروں والی مورتی کو دیکھ کر ڈر گیا۔ بچے نے کہا ''یہ منہ کھولے ہوئے شیر مجھے کھا ڈالیں گے...... ماں چلو یہاں سے واپس چلتے ہیں۔'' بچے کی ماں خاموش تھی کیلا رام نے کہا بچے یہ شیروں والی پتھر کی مورتی بے جان مجسمہ ہے یہ کسی کو کھا نہیں سکتی۔ اسکے بعد کیلا رام نے بچے کو مطمئن کرنے کے لئے مورتی کو ہلکی سی تھپکی بھی دی اور ہنستے ہوئے کہنے لگا......لو دیکھو میں نے اسے چانٹا بھی دیا اسنے مجھے کچھ نہیں کیا۔ اور یہ کر بھی کیا سکتی ہے؟ یہ کہہ کر کیلا رام دیر تک ہنستا رہا......حتی کہ اس کی باچھوں سے خالی مسوڑے دکھائی دے رہے تھے۔۔ پھر آہستہ آہستہ اسکی باچھیں بند ہوگئیں۔ خیر بچہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا...... حاضرین مجلس کا کہنا ہے کیلا رام پر سکتہ طاری ہو گیا......کافی دیر کے بعد وہ گویا ہوا پتہ نہیں لوگوں نے مورتی پوجا کیوں شروع کی تھی جب کوئی کچھ نہیں بولا......تو کیلا رام خود ہی بول اٹھا۔ ''اوم تو ایک ہی ہے البتہ اسکی مختلف صفتوں یا کیریکٹرز کے پہچاننے کیلئے مسلمانوں نے فرشتوں کا تصور قائم کیا اور ہندوؤں نے دیوتاؤں کا......

ہندو ایک ھری اوم کی پالنے والی صفت کو ویشنو کہتا ہے اور پہچان کے لئے اسکا مجسمہ بنا دیا...... جب کہ مسلماں اسے میکائیل فرشتہ جو مدبرات امر میں سے ہے قرار

دیتا ہے......

اسی طرح اوم کی مارنے والے کیریکٹر کو ہندو ''شو'' کہتا ہے اور مسلمان عزرائیل ۔

ہندو ودھیا اور علم ہدایت کی صفت کو برہما کہتا ہے اور مسلمان جبرئیل یا روح قدس وغیرہ

اسکے بعد کیلا رام نے بزور بلند کہا، اوم یا اللہ یا اونکار ایک ہی ہے اس کو کسی سے نفرت نہیں اور نہ ہی دشمنی اور وہ برہمانڈ یعنی کائنات سے الگ بھی نہیں مادہ اسکا گھونگھٹ یا لباس ہے......

تقریباً دو دہائی پہلے کیلا رام فوت ہوگیا......لیکن آج بھی لوگ اس کے حسن اخلاق اور بعض فراست والی باتوں کو یاد کرتے ہیں......



# سائیں نیلا

(مختصر کہانی)

جوان بلی جھپٹ اور پھرتی سے شکار کرتی ہے اور وہ بوڑھی ہونے پر دماغ اور تدبر سے کام لیتی ہے......بعض انسانوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے......انہوں نے مفت روزی کمانے کے لئے کئی طریقے ایجاد کئے اور بدستور کر رہے ہیں۔ مثلاً کوئی پیر بن جاتا ہے کوئی مداری کوئی رملیا کوئی باجی کوئی سائیں کوئی گرو کوئی سنت کوئی مہنت......وغیرہ

الگ الگ روپوں میں یہ سبھی پیشہ ور لوگ بھی سرکاری ملازموں کی طرح روزی کمانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ توہم پرست لوگوں میں انکا کام بہت اچھا چلتا ہے میرے علاقہ میں ایک آدمی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کا علاج نہ ہوسکا۔ بیچارہ لنگڑا ہوگیا چونکہ اب وہ زمینداری کام کاج کے لئے نہ رہا تھا۔ لہذا اس نے بال بڑھائے اور پیروں کا روپ اختیار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد میرے علاقہ کے ایک ملازم جو راجوری میں تعینات تھا۔ نے کہا کہ وہ راجوری میں ایک پالکی والے پیر سے ملنے گیا۔ جب پالکی کا پردہ اٹھایا گیا تو وہ پیر صاحب کوئی اور نہ تھے بلکہ انکے اپنے ہی علاقے کا ایک لنگڑا آدمی تھا۔ اسی طرح کا ایک بوڑھا کیا پتہ جوانی میں کیا کرتا رہا؟ میں نے اسے

بڑھاپے کے ایام میں دیکھا......اسکا نام سائیں نیلا تھا۔

پتہ نہیں اب مر گیا یا زندہ ہے۔کئی سال پہلے میں نے اسے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے آسمانی باتیں کرتے سنا تھا......ایک عصا اسکے ہاتھ میں رہتا تھا عصا کے ساتھ کئی چھلے لٹکتے رہتے تھے۔عصا ٹیکتے وقت چھن چھن زنجیر کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ گلے میں اسنے بڑے بڑے منکوں والی درجنوں تسبیحاں ڈالی ہوئیں تھی۔غیب سے چیزیں حاضر کر دینا......اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔۔

میں نے دیکھا کہ بند کمرے میں اسنے آملے کے تازہ پھل کو چھت سے گرایا۔ زمیں کھود کر پرانا جادو نکال دیتا تھا......مشہور تھا کہ وہ جادو کو زمین کے نیچے نیچے دور سے چلا کر لے آتا تھا۔یعنی وہ گھر بیٹھے ہوئے دور سے جادو کو حاضر کر سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔سائیں نیلا ہر روز ایک پاو مرچی کوٹ کر لسی کے ساتھ ضرور کھاتا تھا......اوراسی مقدار میں لپٹن چائے کی پتی کو ابال کر پیتا تھا جسم سوکھ کر کانٹا بنا ہوا ہے چہرا سیاہ مہیب بڑی بڑی کلف شدہ کالی مونچھیں ،سرخ اور پھٹی ہوئی آنکھیں......البتہ اسکی داڑھی مونچھوں سے بہت چھوٹی ہوا کرتی تھی۔

سر کے بالوں کی لٹیں برگد کی جھٹوں کی طرح لٹکتی دکھائی دیتی تھیں۔ اسقدر بھیناک شکل تھی کہ دن کو دیکھ کر اسے ڈر لگتا تھا......عام لوگ اسے جن ہی سمجھتے تھے۔

کچھ لوگ اسکو سچا سمجھتے تھے اور کچھ لوگ اسے جھوٹا اور فراڈی

کچھ لوگ اسکی پوجا کرتے تھے اور کچھ اسکی اہانت وتوہین۔بہر حال

آخر کسی باغیرت عورت نے پٹھاماں (سایا) نکالتے وقت اسکی دست درازی پر للکارا......عورت نے زبردستی چھیڑ چھاڑ کا کیس کر ڈالا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا......حوالات میں پولیس کی تفتیش اور سخت اذیت اٹھانے کے بعد کے اس نے اپنا تسلیم کیا۔



کہ آملے وہ جیب میں رکھتا تھا اور وہ طیش میں آ کر اپنے جسم کو پھرتی سے سے اینٹھتا اور مروڑتا تھا تو موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ آملے کے پھل کو اپنی جیب سے نکال کر تیزی کے ساتھ چھت کی طرف اچھال دیتا تھا۔لوگ اسکے اینٹھی گئی ٹانگوں اور کپکپاتے جسم کو دیکھ رہے ہوتے تھے۔کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔اور آملا چھت سے نیچے آ گرتا تھا...... اسی طرح جادو نکالتے وقت وہ زمیں کو کھدوا کر خود اسکے اوپر کھڑا ہوتا تھا اور اپنے پاجامے کے نیفے میں رکھے گئے تعویذوں کو پانچے کے اندر سے آسانی سے کھڈے میں گرا دیتا تھا۔اسکی چالاکیاں عام آدمی نہیں سمجھ سکتا تھا۔مداری بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔اسی طرح سائیں نیلا کئی اور کرتب بھی جانتا تھا۔

# بے زباں گدھا

سچ کہوں تو ہمارے سماج میں مرد کی حیثیت کماؤ بیلوں جیسی ہے۔ جو کام بیلوں کی جوڑی بمشکل کرتی ہے وہ کام اکیلے مرد کو کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ تر ایک باروزگار شخص کو اپنے پورے کنبے کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے...... میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ کہ اچانک میں نے قریبی پگڈنڈی پر بڑا ہی جانسوز اور دل پاش نظارہ دیکھا...... ایک آدمی بوڑھے گدھے پر کچھ بوجھ لادا ہوا کسی بالائی مقام کی طرف جارہا تھا...... اسکی جورو بھی سر ایک گٹھڑی اٹھائے پیچھے پیچھے تھی...... غالباً بوڑھے کو تھکان محسوس ہوئی ہوگی یا سواری کا شوق پیدا ہوا ہوگا کچھ تو ہوا کہ وہ خود بھی پہلے سے لدے ہوئے گدھے کے اوپر سوار ہو بیٹھا۔ گدھا بوجھ کے نیچے دبے ہوئے صدفیے یا گھونگے کی طرح آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اسکی ٹانگیں لڑکھڑا رہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان فطرتاً ہی خود غرض پید ہوا ہے۔

بڑھیا نے جب دیکھا کہ بوڑھا گدھے پر سوار ہو چکا ہے۔ تو بڑھیا نے بھی اپنے اصیل اور شریف گدھے کی دم پکڑ لی۔ اگلے ہی پل وہ بھی اس کے سہارے خود کو اوپر کھینچ رہی تھی۔

بیوقوف بوڑھے کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ گدھے کی رفتار مزید کیوں کم ہوگئی ہے۔ گدھا



رک رک کر لمبے سانس بھر بھر کر چل رہا تھا...... کیونکہ بوڑھے کا دھیان تو اپنی منزل کی طرف تھا۔ اسے یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ بڑھیا بھی اپنا بوجھ گدھے کی دم کے سہارے ڈھو رہی ہے...... خیر

بوڑھے اور بڑھیا دونوں ہی کی خود غرضی اور چالاکی کے بوجھ تلے بیچارا بے زباں گدھا دب رہا اور پس رہا تھا...... گدھا جو ہوا اور پھر...... بے زباں گدھا۔

قسط اول

# چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ

حکایت

پرانی بات ہے ایک فقیر جنگل میں چلہ کشی کرنے گیا اسکا یہ چلہ چالیس شب و روز کا تھا۔اس چلے کی شرطیں کچھ یوں تھیں پہلی شرط: چالیس شب و روز کسی انسان کے منہ نہیں لگنا۔دوسری شرط: چالیس شب و روز سادہ سی غذا لینا۔اور صرف اپنے ہاتھوں سے کھانا۔اور تیسری شرط: جنگل میں۔ خدا کی مخلوق سے حتی المقدور پیار، محبت اور شفقت کرنا۔چالیس شب مکمل جاگنا۔ دن کے وقت کسی غار میں تھوڑی دیر نیند یا آرام کرنا اور راتوں کو اوراد پڑھنا اور عجائب دیکھنا۔اور پانچویں شرط: اپنے آتش کدہ کو بجھنے نہیں دینا۔

موسم بہار آچکا تھا۔فقیر نے تھوڑے سے آلو، ایک دو برتن جن میں پانی پی سکتا تھا یا پھر آلو ابال کر، انہیں تھوڑے نمک سے کھا سکتا تھا۔اسکے علاوہ ایک آدھ کمبل تھوڑا سا نمک اور ماچس کی ڈبیا۔بس اس فقیر کا کل اثاثہ یہی تھا۔جنگل میں جا کر اسنے رہنے کے لئے ایک غار ڈھونڈی جس میں ایک لومڑی کا ڈھانچہ پڑا تھا۔اور وہ مقام عام انسانوں کی پہنچ سے دور تھا۔فقیر نے لومڑی کی ہڈیوں کو اٹھا کر باہر پھینکا اور غار کے



اندر دہانے کی طرف کھڈا کھود کر آتش کدہ جلا لیا۔دن کو بڑی بڑی لکڑیاں اکٹھے کرتا اور انہیں مسلسل آتش کدہ میں جھونکتے رہتا۔کچھ آلو کاٹ کر اس نے غار کے قریب کھلی اور مٹی والی جگہ میں دبا دئے۔

فقیر دن کو لکڑیاں اکٹھا کرتا۔ برتن میں پانی لاتا اور راتوں کو آلو ابال کر کھالیتا اور اپنے اوراد پڑھتا رہتا۔رات کے وقت غار کے دہانے پر اسے کئی قسم کی مخلوق دکھائی دیتی لیکن اپنے اور فقیر کے درمیاں جلتی آگ کا الاو دیکھ کر وہ (مخلوق) غائب ہو جایا کرتی تھی۔

ایک دن فقیر لکڑیاں اکھٹے کر کے پانی بھرنے گیا تو اس نے کنویں میں ریچھ کا بچہ گرا ہوا دیکھا غالبًا وہ پانی پیتے وقت کنویں میں گر چکا تھا۔فقیر نے عبادت سمجھ کر اسکو باہر نکالا وہ بہت کمزور تھا ہو چکا تھا فقیر اسے اپنی غار میں لے آیا تھوڑے آلو کھلائے اسکی حالت بہتر ہوگئی۔ریچھ کے بچے کو باہر جنگی درندوں سے خطرہ تھا لہذا فقیر نے اسے غار کے اندر ہی اپنے ساتھ رکھنا پسند کیا۔فقیر کے چلے ساتھ ساتھ ریچھ کا بچہ بھی بڑا ہو رہا تھا۔

قسط دوئم

# چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ

ریچھ کے بچہ کو غار میں لانے بعد، فقیر کا دن اس کی دیکھ ریکھ میں گزر جاتا تھا اور دونوں ہی کو تھکاوٹ ہو جاتی تھی۔ لہذا رات کو ریچھ کا بچہ اور فقیر دونوں ایک دوسرے سے چپک کر سو جاتے تھے۔

اس طرح چلے کی ''رات بھر اوراد پڑنے جاگنے اور عجائب دیکھنے اور دن کو آرام کرنے'' والی شرط ٹوٹ گئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد فقیر کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ اب ریچھ کا ہوشیار ہو چکا تھا اور اس میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔

ایک دن فقیر ریچھ کے بچے کو غار میں چھوڑ کر سوکھی لکڑیاں توڑنے گیا۔ اسنے گھاس پر تازہ خون کے قطرے دیکھے وہ خون کے قطروں کے نشانوں کا پیچھا کرتے آگے چلتا گیا۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں زخموں کی تاب نہ لا کر، مری ہوئی ہرنی کو دیکھا۔ ساتھ ہی اس ہرنی کا چھوٹا سا بچہ اپنی مردہ ماں کے تھنوں سے دودھ نکالنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

فقیر کو ہرنی کے بچے پر رحم آ گیا وہ اس کو اٹھا کر اپنی غار میں لے آیا۔ نئے مہمان کی آمد سے غار میں جگہ کم پڑ گئی تھی لہذا فقیر نے اپنے آتش کدہ کو بجھا دیا۔ اس طرح



''آتش کدہ کو مسلسل چالیس دن مسلسل جلائے رکھنے'' کی شرط بھی فوت ہو چکی تھی۔

اب غار میں فقیر کے ایک پہلو ہرن کا بچہ تھا اور دوسرے پہلو میں ریچھ کا بچہ۔ ان کو ایک ساتھ رکھنا یا اکیلے چھوڑنا غیر مناسب تھا۔ کیونکہ ریچھ کا بچہ ہرنی کے بچے کو مار سکتا تھا۔ چلے کو پورا ہونے ابھی دو دن باقی تھے۔ ادھر ہرنی کا بچہ بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا فقیر نے رات اسی کشمکش میں گزاری۔

اگلی صبح فقیر نے ریچھ کے بچے کو غار کے باہر خیر آباد کہا اور خود ہرنی کے بچے کے اٹھائے ہوئے شہر کا رخ کیا۔ شہر میں پہنچ کر فقیر نے ایک آشنا دودھ والے کی دکان سے دو گلاس دودھ کے لئے۔ ایک گلاس ہرن کے بچے کو پلایا۔ اور دوسرا خود پی لیا۔ ہرن کے بچے کو آسودہ دیکھ کر فقیر کو بہت خوشی ہوئی۔ اسکے بعد فقیر نے جب ڈکار ماری تو اسے اسے خیال آیا۔ '' چلے کی پہلی اور دوسری شرطیں' چالیس شب و روز کسی انسان کے منہ نہیں لگنا، اور '' چالیس شب و روز سادہ سی غذا لینا۔ اور صرف اپنے ہاتھوں سے کما کر کھانا'' بھی فوت ہو چکی تھیں۔

لیکن فقیر کا خیال جب ریچھ کے اچھلتے کودتے بچے کی طرف گیا جسے وہ غار کے باہر چھوڑ کر آیا تھا اور پھر ہرنی کے بچے کو اپنے سامنے چھلانگیں مارتے ہوئے تو اس نے دل ہی دل میں کہا: چلو، چلے کی ایک شرط تو پوری ہوئی '' خدا کی جنگی مخلوق سے حتی المقدور پیار، محبت اور شفقت کرنا۔''

چالیس دن پورے کرنے کے بعد فقیر نے دیکھا کہ ہرنی کا بچہ گھاس چرنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس کا خیال ریچھ کے بچے کی طرف گیا جس کے سپرد وہ اپنی چلے والی غار کر آیا تھا۔

قسط سوم

# چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ

چالیس دن گذر چکے تھے......فقیر کو چلے کی بیچ والی شرط یعنی ''مخلوق سے محبت اور شفقت کرنا'' پر عمل پیرا ہونے کی خوشی ہو رہی تھی......فقیر سمجھتا تھا عبادت کا بنیادی مقصد خدا کی مخلوق سے محبت اور شفقت کرنا ہے اور سب سے اچھا آدمی وہی ہے جو خود نقصان اٹھا کر لوگوں اور خدا کی مخلوق کو فائدہ اور راحت پہنچائے۔ خدا کی مخلوق میں مور و ملخ سے لیکر پرندے چرندے درندے، سینہ مال خزندے، آدم پست اور انسان بھی شامل ہیں۔ اسکے علاوہ تمام تر عبادتیں اصلاح نفس اور فقیروں کی ذات کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ جزبۂ خدمتِ خلق، اصل گوہر مقصود فقیر کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ اور خدا کی مخلوق سے محبت اور شفقت کرنا، اس کا شیوہ ہی بن چکا تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ہرنی کا بچہ گھاس چرنے چگنے اور تیزی سے چوکڑی بھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ فقیر اب ہرنی کے بچے کو اس کے فطری اور قدرتی ماحول میں لوٹانا چاہتا تھا۔

فقیر نے ہرنی کے بچے کو اٹھایا اور جنگل میں جا کر ہرنیوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیا۔ اور فقیر جھاڑیوں میں سے چھپ کر دیکھنے لگا۔ فقیر کو یہ دیکھ کر حیرانگی ہوئی کہ ایک ہرنی



غالباً جسکا بچہ دندوں نے مار دیا تھا اس نے آ کر اس نو وارد ہرنی کے بچے کو شفقت سے چاٹنے لگی تھی اور اس نو وارد نے اس ہرنی کا تھن پکڑ لیا اور مشفق ماں سمجھ کر چوسنا شروع کر دیا......اجنبی ہرنی بھی اس نو وارد کو اپنا ''بچۂ بازیافتہ'' کو پیار سے چاٹنے لگی تھی۔ فقیر کو یوں لگا کہ اس نے ایک گم شدہ بچے کو اسکی مہجور اور تڑپتی ہوئی ماں سے ملا دیا۔ یہ سوچ کر فقیر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ عبادت کی روحانی لذت اٹھا رہا تھا۔

ہرنی کے بچے کو اپنے جھنڈ کے حوالے کر کے فقیر کو خیال آیا کہ واپسی پر اپنی پرانی غار میں ریچھ کے بچے کی خبر لیتا چلے۔ یہ سوچ کو وہ اپنی چلے والی غار جو تھوڑی دوری پر تھی کی طرف بڑھا۔ لیکن غار کے دھانے پر ایک اژدھے کو بیٹھا دیکھ کر فقیر کو سخت غم اور حیرانی ہوئی۔ اسکا خیال مسلسل ریچھ کے بچے کی طرف جا رہا تھا جو اسے غار میں دکھائی نہیں دے رہا کیونکہ غار کے دھانے پر ایک اژدھا پھن اٹھائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ فقیر کو دیکھتے ہی اژدھے نے پھنکارنا شروع کر دیا......اژدھا آسانی سے اپنے شکار کو چھوڑنے اور غار کے دھانے سے جانے والا نہیں تھا۔

فقیر پیچھے ہٹ کر ایک درخت پر چڑھا جو غار کے دہانے کے سامنے تھا فقیر نے دیکھا کہ ریچھ کا بچہ غار میں ہے لیکن نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ اژدھے نے اسکا راستہ روکا ہوا تھا...... بلکہ ریچھ کا بچہ اگر اپنا دفع کرنے کے قابل نہ ہوتا تو اژدھے نے کب کا اس کو نگل لیا ہوتا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کتنے دنوں سے انکی یہ کشمکش چل رہی تھی۔

فقیر، اژدھا کو بھگا کر ریچھ کے بچے کو غار سے آزاد کرنے کی فکر میں تھا۔

آخری قسط

# چلہ کش فقیر اور ریچھ کا بچہ

اژدھے نے غار کے اندر ریچھ کے بچے کو بری طرح گھیرا ہوا تھا۔ دراصل وہ اس کو مار کر کھانا چاہتا تھا۔ لیکن ریچھ کا ہونہار بچہ چھ چھ انچ لمبے ناخنوں سے اپنا دفع کرنا جانتا تھا۔ جب کبھی اژدھا وار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ریچھ کا بچہ بڑی سرعت سے پنجے مار کر اژدھے کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ لیکن ریچھ کا بچہ کمزور ہو رہا تھا۔ فقیر دیرینہ صحبت اور دوستی کی بنا پر ریچھ کے بچے کو اژدہے سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔

فقیر، اژدھے سے تھوڑی دور کھڑا ہو کر زور زور سے چلانے لگا لیکن اسے لگا کہ اژدھا آواز نہیں سن رہا تھا۔ فقیر جلال میں آ گیا۔ اس نے تیز اور زوردار پاکوب رَقص شروع کر دیا۔ اسکے پاؤں مارنے اور زوردار تھرکنے سے آس پاس کی زمیں لرزنے لگی۔ تھرکتے پاؤں کی جنبشوں سے اژدھا ڈر گیا۔ فقیر کا رقص جوں جوں تیز ہو رہا تھا اژدھا غار کے دہانے سے ہٹ رہا تھا۔ فقیر کے لمبے وقفے پر پھیلے ہوئے رقص نے آخر کار اژدھے کو غار کے دھانے سے بھاگنے پر مجبور کر دیا...... اژدھا کے جانے کے فوراً بعد ریچھ کا جواں سال بچہ اپنی چھوٹی دم ہلاتے ہوئے باہر آ گیا...... اور فقیر کے پاؤں چاٹنے لگا۔



فقیر ستا رہا تھا کیونکہ وہ تا دیر رقص کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ لیکن دونوں پرانے دوستوں نے خود کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کیا دیکھا کہ ان کی خستہ جانوں میں غیب سے نئی توانائی آ گئی۔ فوراً ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

فقیر پھر اسی غار میں رہنے لگا اس نے دوبارہ سے چلہ کرنے کی نیت باندھ لی۔ اور بہت بجھ چکے آتش کدہ کو دوبارہ جلایا...... اور پرانی شرائط کے ساتھ دوبارہ چلے کی شروعات کی۔ اب کی بار ریچھ کا جواں سال بچہ فقیر کے احسانات کی وجہ سے غلام بن چکا تھا۔ وہ دن کو جنگل میں چلا جایا کرتا تھا۔ اس نے یہ معمول ہی بنا لیا تھا۔ رات کو وہ فقیر کی غار کے باہر غلاموں کی طرح حفاظت کے لئے بیٹھ جاتا۔ اب وہ فقیر کا ہمدرد دوست تھا اور غلام بھی...... وہ دن کے وقت پیٹ پالنے کے چکر میں دور جنگل میں نکل جاتا۔ لیکن رات کو فقیر کی غار کے آس پاس ہی رہتا۔

کئی دن چلے کے دوران بھوک سے فقیر نڈھال ہو چکا تھا اسے زندہ رہ کر چلہ پورا کرنے کے لئے تھوڑی غذا کی ضرورت تھی...... لیکن بے بس ہو چکا تھا پہلے سے موجود آلو بھی ختم ہو چکے تھے۔

فقیر نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت ایک دودھیل ہرنی جسکے لمبے لمبے تھنوں سے دودھ سے ٹپک رہا تھا۔ قدرت کا کرشمہ ہوا کہ وہ بے جھجک نتھنے پھیلائے ہوئے فقیر کو سونگتی ہوئی غار کے اندر چلی آئی۔ اسکے پیچھے اسکا بچہ بھی تھا۔ فقیر نے غور سے دیکھا تو یہ وہی ہرنی کا مادہ بچہ تھا جو اب ماں بن چکی تھی۔ فقیر نے ہرنی کے بچے کو گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا۔ فقیر کو محسوس ہوا گویا وہ اسکا معنوی پوتا یا دوتا تھا۔ اسکے بعد فقیر پر لحظہ بھر کے لئے غنودگی طاری ہو گئی۔

''ھل جزاء الحسان الا الاحسان......'' فقیر کو ہاتف غیب نے کہا کہ تم ہرنی کے چار تھنوں میں سے دو تھنوں کا دودھ اپنے ہاتھوں سے نکال کر پی سکتے ہو...... اور ''باقی

دوتھنوں کا دودھ ہرنی کے بچے کے لئے چھوڑ دو۔''

فقیر نے ایسا ہی کیا۔ چوبیس گھنٹے میں بموجب امر الٰہی ہرنی ایک بار، ہر روز دوپہر کے وقت فقیر کی غار میں آ کر اسے دودھ دے جاتی تھی۔

فقیر دودھ پی کر دن کو آرام کرتا اور رات کو جاگ جاگ کر روحانی عجائب دیکھتا۔ ادھر غار کے باہر سیاہ وردی پوش بہادر جانباز ریچھ اسکا پہرا دیتا۔ عجیب سنتری اور محافظ تھا وہ۔

دن کو...... ہرنی، فقیر کے پاس آتے دیکھ کر پرندے بھی قریب اڑنے پھرنے لگے۔ پرندے حشرات وغیرہ بے خطر فقیر سے کھیلتے کودتے۔ ویسے بھی سچا فقیر سب کا دوست ہوتا ہے۔ فقیر کی گودڑی میں بچھوؤں کا مسکن تھا...... لیکن بچھو اسکو کاٹتے نہیں تھے۔ ایک طرف پتھروں میں شہد کی مکھیوں نے چھتا لگا لیا تھا۔ ایک دن فقیر کی غار میں کبوتروں نے انڈے دیے اور پھر کچھ دنوں کے بعد انہیں سنا بھی۔ اب کی بار فقیر کا چلہ بخیر و عافیت مکمل ہو گیا۔ چالیس دن کے بعد کبوتروں کے جوڑے امن و سلامتی کے نامہ بر بن کر بستی بستی جا پہنچے تھے۔ اور محبت و شفقت کا پیغام سنانے میں مشغول ہو گئے۔

فقیر سدا بہار زندگی اور گونا گونی زیستی علامت بن چکا تھا۔ اس سراپا دور زندگی پر پرندے چرندے اور درندے زبانِ حال سے سلامتی کی دعا بھیجتے تھے کیونکہ وہ فقیر مردِ عارف، سلسلۂ مدارج و مراحل مختلف حیات کو بخوبی سمجھتا تھا۔



# سیلاب زدہ بستیاں

(کہانی)

بندھ ٹوٹنے پر سیلاب کا پانی شہر میں گھس چکا تھا۔ شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے بچے ڈوب چکے تھے مرد اور عورتیں سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ کوئی چھاتی تک پانی میں ڈوبا ہوا، چیخ و فریاد کر رہا تھا اور کوئی گردن تک۔

پانی کا لیول(Level) آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ خوف و ہراس کا عالم تھا۔ کچھ لوگ گھروں کی دوسری چھتوں پر تھے لیکن کچی اینٹوں کی دومنزلہ عمارتوں کو گرنے کا خطرہ تھا کیونکہ انکی کچی دیواریں پانی میں گھل گھل کر بیٹھ رہی تھیں سب سے زیادہ پریشان کھلی سڑکوں اور پلے گرونڈز میں موجود لوگ تھے کیونکہ اگر پانی کا لیول ایک آدھ فٹ اوپر چڑھ جائے تو انکا ڈوبنا یقینی تھا۔ گلیاں سڑکیں اور کھلی جگہیں جھیل کی طرح بن چکی تھیں۔ اسی اثنا میں مسلح اشخاص کشتیوں میں بیٹھے ہوئے نمودار ہوئے۔ لوگ امداد اور نجات کے لئے چیخنے لگے تھے۔ لیکن جہاں کہیں سے انکی آواز آتی تھی وہاں ٹھس کی آواز آتے ہی ارد گرد کا پانی تھوڑی دیر کے لئے لال سرخ ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ چیخ، پکار، فریاد اور مدد طلب کرنے والی آوازیں بند ہو چکی تھی۔ اور جہلم کے مٹیالے پانی میں انسانوں کے خون کا رنگ و ذائقہ شامل ہو چکا تھا۔ یہ گواہی باقی ماندا اور بچے کھچے ہوئے لوگوں

نے دی۔

اندھیرا گاڑا ہوتے سے پہلے ہی وہ مسلح اشخاص جنگی ہینڈ گنوں میں ''بلٹ ان سائلنسرز'' Built-in-silencer فٹ تھے۔ اپنے خالی پوچوں اور مرنیوالے لوگوں کی قیمتی اشیا اور زیورات کے ساتھ بھری ہوئی کشتیوں کے ساتھ، سیلاب زدہ بستیوں سے جا چکے تھے۔



قسط اول

# اونٹ اور گیدڑ کی کہانی

(کہانی)

دوستی کے لئے ذہنی ہم خیالی پہلی شرط ہے۔ گیدڑ نے جب دوستی کی پیش کش کی تو اونٹ نے اس کی پیش کش کو کچھ دنوں کے لئے معلق رکھا۔ دراصل اونٹ دوستی کی گرہ باندھنے سے پہلے تھوڑا سوچنا چاہتا تھا۔ اونٹ کے دماغ میں کئی شبہات تھے اور اشکال بھی۔ بہرحال اونٹ نے ہاں بھرنے سے پہلے بات چیت کا دور جاری رکھا۔

اونٹ نے گیدڑ سے کہا:

تم سے میری دوستی کیونکر نبھ سکے گی تم چھوٹے ہو اور میں بڑا......تم ہمیشہ ڈرے ہوئے چوروں کی طرح بھاگتے رہتے ہو اور جبکہ میں بڑے وضع داروں کی طرح سوچ سمجھ کر ضرورت کے مطابق ہی بات کرتا ہوں۔

گیدڑ نے اونٹ کو مفکرانہ جواب دیا:

جسمانی ساخت کے اعتبار سے چھوٹا بڑا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بات صرف اور صرف عقل و دماغ کی ہے اور سوچ سمجھ کی۔ یقیناً میں دماغی اعتبار سے آپ سے کم نہیں۔

رہی بات میرے دوڑنے کی میں واقعی دوڑتا رہتا ہوں زندگی نام ہی دوڑ و دھوپ کا

ہے۔آپ کی سستی کا فائدہ آدمی نے اٹھا کر۔تم اونٹوں کے آدھی جماعت کو اپنا غلام بنالیا۔لیکن آدمی آج تک مجھے پالتو نہیں بنا سکا۔

اونٹ گیدڑ کی بات سے قدرے مطمئن ہو کر کہنے لگا:

پہلی بات سے میں کسی حد تک متفق ہوا۔چلو دوستی کی شرط کے لئے قد کا برابر ہونا ضروری نہیں۔ہم خیالی کے علاوہ ہوشیری مساوی ہونی چاہیئے۔یہ بھی تم نے درست کہا۔چلو اس اعتبار سے تم میرے برابر ہو سکتے ہو۔لیکن میرے خیال میں دوستی رشتہ داری ذات برادری کے اندر ہی جچتی ہے۔

گیدڑ نے طنزآمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

آج دنیا گلوبل ولیج بن چکا ہے آپنے یہ پرانے دور کی نہایت گھٹیا بات کی ہے۔اس عہد میں ذات جماعت کا کوئی تصور اور جواز سرے سے موجود ہی نہیں۔البتہ ہماری سوچ اور رنگ ڈھنگ کسی قدر ملتے ہیں۔اور پھر ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا آپ میری دوستی کا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں۔؟

اونٹ نے گردن ہلاتے ہوئے گیدڑ سے کہا۔چلو رنگ ڈھنگ اور سوچ کی بات کو چھوڑو۔باتوں سے باطن کا پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ باتوں میں دغل کاری ریاکاری اور منافقت سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

تم جیسی حقیر مخلوق میرے کس کام آسکتی ہے ہمارے کھانے پینے سونے جاگنے اور رہن سہن کے آداب بالکل نہیں ملتے۔

گیدڑ نے جب سوچا کہ اسکی چالاکی اور ہوشیاری اونٹ کو متاثر نہیں کر رہی اور نہ ہی اس طرح اونٹ کو دوستی کے لئے قائل کیا جاسکتا ہے......لہذا تدبر کے ساتھ اونٹ کی ثناستائش اور چاپلوسی بھی کرنے پڑے گی۔

گیدڑ نے جھک کر کہا۔میں سوچتا ہوں آپ جیسے عظمت ووقار کے پہاڑ کے ساتھ



دوستی کر کے مجھ ناچیز وکم حیثیت کی عزت بھی بڑھ جاتی۔آپ عقل ودانش میں ہر جانور سے آگے ہیں حتی کہ براق ودلدل بھی آپکے سامنے ہیچ ہیں......یہ کہہ کر گیدڑ نے رونا شروع کر دیا۔

اپنی تعریف سن کر اونٹ کا پیٹ پھول چکا تھا۔اور وہ بیقرار ہو رہا تھا۔خیر ریح کے خارج ہونے سے تھوڑا افاقہ ہوا۔اونٹ نے گیدڑ کو روتے دیکھ کر پوچھا۔کیوں رو رہے ہو عزیز۔

گیدڑ نے لوہے کو گرم دیکھتے ہی دے ہتھوڑا مارا۔

''حضور میرا ایک ماما ہوتا تھا وہ بہت سیانا اور دانا تھا لیکن آخر۔۔ایک دن شیر نے اسے مار گرایا مجھے آپکی باتوں سے اسکی ذہانت کی خوشبو آرہی ہے۔یہ کہہ کر گیدڑ نے اور زور سے رونا شروع کر دیا۔

اونٹ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔میرے سامنے مت رو۔آج سے میں ہی تمہارا ماموں ہوں۔اور تو میرا بھانجا۔''دوستی کی دوستی رشتے کا رشتہ۔''

گیڈر دل ہی دل میں ہنسا اور زور زور سے ''ماموں جان ماموں جان'' کہتا ہوا اونٹ سے بغل گیر ہونے کے لئے آگے بڑھا لیکن جب وہ اونٹ کی گردن تک نہ پہنچ سکا تو بہت شرمندہ ہوا۔پھر اونٹ نے اس کو ہمدردی جتاتے ہوئے کہا:

میرے پیارے بھانجے آج سے ہم اس جنگل میں اکٹھے رہیں گے اور ایک دوسرے کی تنگی تکلیف اور خوشی غمی میں شریک ہوا کریں گے۔مزید اونٹ نے کہا۔شیر واقعی ظالم ہے پچھلے سال اس نے میرے شیر خوار بچے کو پھاڑ کر کھا ڈالا تھا۔ہم سب جنگلی جانوروں کو مل کر ایک ساتھ رہنا چاہیئے۔گیدڑ نے کہا۔ٹھیک ماموں جان۔ٹھیک

اونٹ کو ماموں کہنے کے بعد گیدڑ ہر بار مسکراتا تھا اونٹ کو شک ہوا کیا بات ہے بھانجے تم بار بار مسکراتے کیوں ہو؟

گیدڑ نے ایکٹنگ کر کے سر جھکا لیا۔

دل ہی دل میں اونٹ کو گالیاں دینا شروع کیں۔

''او لمڈھنگے تو میرے باپ کا سالا نہیں تو اور کیا ہے۔

گیدڑ نے کئی بار دل ہی دل میں۔ میرے باپ کا سالا

میرے باپ کا سالا''

اونٹ نے کہا بھانجے جواب کیوں نہیں دیتے کیا سوچتے ہو۔

گیدڑ نے جھوٹے ہی روتے ہوئے کہا۔ آج اگر میرا ماموں زندہ ہوتا تو مجھے آپ کی یہ کڑوی کسیلی باتیں نہ سننی پڑتیں۔ لیکن افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں۔

اونٹ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور جلدی جلدی کہنے لگا۔ ''بھانجے مت رو...... میں نے غلط سوال کیا۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔'' مزید یہ کہکر اونٹ نے آگے بڑھ کر گردن جھکالی اور مکار گیدڑ نے اس کے ساتھ تین بار معانقہ کیا۔

گیدڑ نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اونٹ سے کہا۔ جب میں چھوٹا تھا تو میرا ماموں مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ندی پار کراتا تھا۔ اور سیر کے لئے بھی لے جایا کرتا تھا۔ کاش میرا اصلی ماموں زندہ ہوتا۔

نرم دل اور سادہ لوح اونٹ گیدڑ کی باتوں میں آ گیا اور اس سے کہنے لگا۔ میں نے تمہیں بھانجا یونہی تھوڑا کہا ہے...... تمہیں پتہ ہونا چاہئے ہم اونٹ قربانی کے جانور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔



قسط دوم

# اونٹ اور گیدڑ

(کہانی)

اونٹ کے وعدۂ دوستی کا گیدڑ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اونٹ اور گیدڑ جس جنگل میں رہتے تھے۔ اس کے سامنے دریا کی دوسری طرف ایک بستی تھی۔ برسات کے مہینوں میں دریا میں پانی بڑھ چکا تھا۔ لہذا گیدڑ کے لئے دریا پار کر کے بستی سے مرغے وغیرہ پکڑ نا کر کھانا ناممکن بن چکا تھا۔ یہ دوستی کا ناٹک اسی لئے کیا گیا تھا بہر حال اونٹ بے خبر تھا۔

شریف اونٹ سے ایک دن گیدڑ نے کہا۔ ماموں میرا دل کرتا ہے کہ دریا کے پار سامنے والے کھیتوں میں سیر کو چلا جائے۔ وہاں آپ کو بھی کھانے کو ہری اور تازہ فصلیں مل جائیں گی اور میں بھی بستی کی سیر کرلوں گا۔ گیدڑ نے مزید کہا ویسے میری نیت خراب نہیں۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔

اونٹ نے کہا۔ بھانجے غریب کسانوں کی فصل کو چوری چوری یا کھلے میں کھانا ہرگز درست نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ جنگل کی کانٹے دار جھاڑیاں کھا کر گزارا کیا جائے۔ کسی کا حق مارنے والا ظالم ہوتا ہے ظالم کی حمایت یا مدد کرنے والا بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔

گیدڑ نے کہا: موموں آپ بہت پرانی وضع کے سادے مرادے ہیں۔ کسانوں کی فصلیں سیلاب آندھی اور اولوں کے پڑنے سے بھی تو خراب ہوتی رہتی ہیں۔ اگر آپ نے بھی مٹھی بھر فصلیں کھالیں تو کسانوں پر کونسا قہر یا آفت ٹوٹ پڑے گا۔

اونٹ نے کہا: مرے ہوئے کو مارنا اچھا نہیں۔ دیکھو میں لگاتار اخباروں میں پڑھتا رہتا ہوں کہ ہمارے ملک بھارت میں قرضوں کی نیچے دبے ھوئے ہزاروں کسان ہر سال خودکشی کرتے ہیں۔ ان فصلوں سے حاصل ہونے والے منافع انکے بال بچوں کا پیٹ بھرنا تو درکنار قرضے کے سود میں ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ ہاں آپکی سیر والی بات کی تائید کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر اونٹ چارزانو بیٹھ گیا اور گیدڑ سے کہا۔ بھانجا میری پیٹھ پر چڑھ جا۔ گیدڑ اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوگیا دریا میں پانی کافی تھا دریا پار کرتے وقت پانی اونٹ کی پیٹھ کے اوپر سے پھر گیا۔ قریب تھا گیدڑ بہہ جاتا مگر وہ اونٹ کی کوہان پر چڑھ گیا۔ دریا پار کرنے کے بعد گیدڑ نے پیٹھ پر چھلانگ ماری اور خود ہی جلدی نیچے اتر گیا۔

خودغرض آدمی کی دوستی مطلب پورا ہونے تک ہی ہوتی ہے۔

اونٹ نے کہا بھانجے تم نے چھلانگ کیوں ماری؟ ایسے میں تجھے چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ گیدڑ نے کہا: میں جلدی میں ہوں۔ ذرا رفع حاجت سے فارغ ہوکر آتا ہوں۔ آپ یہاں ہی میرا انتظار کریں۔ اور وہ بھاگتا ہوا کھیتوں میں غائب ہوگیا۔

دراصل وہ کسانوں کے گھروں کی طرف چلا گیا تھا اور جلد ہی ایک بیوہ عورت کی مرغیاں مرغے جو بے خبری میں دانے چگ رہے تھے۔ گیدڑ نے گھات لگا کر حملہ کیا اور ایک انڈے دینے والی بوجھل مرغی کو پکڑ کر ہوا ہوگیا۔ جھاڑیوں میں بیٹھ کر آدھی مرغی کو آرام سے کھایا باقی آدھا حصہ پنجوں سے گھڑا گود کر اس میں رکھا اوپر سے ٹہنیاں وغیرہ رکھ کر اچھی طرح دبا دیا۔ جگہ کو دائیں بائیں دیکھ کر اچھی طرح یاد رکھ لیا۔ اور منہ



صاف کر کے اونٹ کے پاس پہنا۔

اونٹ نے کہا: بھانجا آپ نے تو رفع حاجت میں بہت وقت لگا دیا۔

گیدڑ نے کہا۔ ماموں کچھ دنوں سے مجھے قبض کی شکایت ہے۔ پھر گیدڑ نے کہا ماموں اتنی دیر تم کیا کرتے رہے۔ اونٹ نے کہا کچھ نہیں...... یونہی کھڑا رہا سوچا تھا کہ سامنے والی جھاڑی کے ہرے ہرے پتے کھالوں مگر پھر خیال آیا یہ کسی یتیم یا بیوہ کی گائے کا چارہ ہوسکتے ہیں۔ لہذا میں جگالی کرتا رہا اور کل کے کھائی ہوئی جھاڑیوں وغیرہ کو آج جگالی کے ذریعے ہضم کرتا رہا۔ اتنے میں کسانوں، کتوں کے جھنڈ کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ گیدڑ نے کہا ماموں شاید گاؤں میں کوئی چور داخل ہو چکا ہے چلو دریا پار جنگل میں چلتے ہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ پر شک کرنے لگیں۔ اور ساتھ میں میں بھی مارا جاؤں۔

یہ سنتے ہی اونٹ چارزانو۔ بیٹھ گیا اور گیدڑ کے سوار ہوتے ہی اونٹ نے جلدی جلدی دریا پار کیا۔

دریا پار کرتے ہی گیدڑ چھلانگ مار کر نیچے اتر گیا۔ اور دریا کے دوسری طرف کسانوں کے کتوں کے علاوہ ایک بیوہ بھی زورزور سے رورہی تھی۔ گیدڑ نے کہا شاید کسی نے بیوہ کا کچھ چرالیا ہے یا فصل کو نقصان پہنچایا۔ اونٹ نے قسمیں کھا کھا کر صفائیاں دیں اس کے بعد اونٹ نے گیدڑ سے کہا: بھائی کہیں تم نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟

آخری قسط

# اونٹ اور گیدڑ

## (کہانی)

ایک دن اونٹ اور اونٹنی جنگل میں چر رہے تھے۔اونٹ کو جب موج اور مستی کا خیال آیا۔تو وہ اونٹنی کے قریب گیا۔اونٹنی سخت ناراض تھی اس نے نتھنے پھیلا کر اپنی بے رخی کا اظہار کیا۔ اونٹ کی مزید پیش قدمی پر اونٹنی نے اسکو کاٹنے کے لئے منہ بھی کھولا۔اونٹ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

اونٹ نے کہا جان من آج آپ کو کیا ہو گیا۔؟

اونٹنی نے طعنہ دیتے ہوئے اونٹ سے کہا۔آپ بھی مرد لوگوں کی طرح ؟من مرضی کے کام کرتے ہیں۔

مرد لوگ اپنی عورتوں کو غلام سمجھتے ہیں اور اپنی رائے یا مرضی کے تحت چلاتے ہیں ان میں اونچ نیچ بھی پائی جاتی ہے لیکن جنگلی جانوروں کی برادری میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر برادری کے سبھی افراد برابر ہوتے ہیں۔

مثلاً سب گیدڑ برابر ہوتے ہیں ان کا مذہب فطری طور پر ایک ہی ہوتا۔ان کی جبلتیں بھی مساوی ہوتی ہیں۔جبکہ انسانوں نے کئی خود ساختہ مذاہب بنا کر انسانیت کو پارہ پارہ کیا ہوا ہے۔بہرحال تم نے گیدڑ سے دوستی کر کے اونٹوں کے آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔مزید اونٹنی نے صحرائی برادیوں کی گاتھائیں پڑھ پڑھ کر اونٹ کو



سنائیں۔اور یہ بھی کہا۔ہم جنگل کے جانور ہیں۔ہم انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے غلام نہیں فطری تقاضوں کے تحت ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

تم نے گیدڑ سے دوستی کر کے اچھا نہیں کیا۔ ہماری بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔دو تین دن سے میں پریشان ہوں میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ دوستی کی پینگ ایک دم نہیں بڑھانا چاہئے بلکہ دوستی بھی رس بھرے میووں کی طرح آہستہ آہستہ پختہ ہو تو اچھی ہوتی ہے۔اور دوسری مخلوق سے تو دوستی مہلک اور وبال جان بن سکتی ہے۔

ادھر جنگل میں اونٹنی گیدڑ کو سمجھا رہی تھی......

تو دوسری طرف انسانوں کی بستی میں......

گیدڑ اور اونٹ کی دوستی کا چرچا ہو رہا تھا......

مولوی اکرام دین نے غسل کرتے ہوئے علی الصبح اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر گیدڑ کو دریا آر پار کرتے دیکھ لیا تھا۔اور وہ دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اسنے مسجد میں موجود لوگوں کو سنایا تھا کہ" آخری زمانہ آن پہنچا ہے۔صرف حضرت مہدی موعود کا آنا باقی ہے اور کانے دجال کا مرنا۔

پھر اس نے توبہ استغفار پڑھتے ہوئے کہا۔کہ اگر جنگلی جانور اس طرح مل کر ایک دماغ سے کام کرنے لگے تو ہم لوگوں کو خطرہ ہی خطرہ ہے۔دیکھو اونٹ نے گیدڑ کو دریا پار کروا کے انسانوں کی بستی میں لایا اور پھر واپس بھی لے گیا۔اور اس گیدڑ نے بیوہ کی مرغی کو مار ڈالا۔غلط کام میں حمایت کرنے والا برابر کا مجرم ہوتا ہے۔

لوگ مولوی کی تقریر سن کر مشتعل ہو گئے۔انہوں نے لمبے لمبے رسے لئے اور دریا کو پار کر کے جنگل کو گھیرے میں لے لیا۔پھر آہستہ آہستہ گھیرے کو سکیڑتے ہوئے، ایک ایک کر کے سب جنگلی اونٹوں اور اونٹنیوں کو پکڑ لیا۔لوگوں نے آہستہ آہستہ اونٹوں کو سدھا لیا۔جس کسی اونٹ یا اونٹنی نے سرکشی کی تو لوگوں نے اسکے ناک کو چھید

کر نکیل ڈال دی اور نکیل کے ساتھ لگی رسی لگا کر کیل یا کھونٹی سے باندھ دیا۔اور پھر قربانی کی تاریخ آتے ہی لوگ اسے ذبح کر کے اسکا گوشت تبرکاً کھالیا۔اسطرح انسانوں نے اونٹوں کا حق آزادی چھین کر ہمیشہ ہمیشہ کے نسل درنسل غلام بنا لیا۔ آہستہ آہستہ اونٹ بھی جنگل کی وہ آزادی بھول گئے۔اس طرح ایک صحرائی گیدڑ کی دوستی کی وجہ سے پورے عرب بلکہ ساری دنیا کے اونٹوں کی آزادی چھن گئی۔اور گیدڑ آج بھی آزادی کے مزے اڑا رہے ہیں۔



# آوارہ گدھا اور بیمار بیل

(کہانی)

مڑیل گدھے کو مالک نے وبالِ جان سمجھ کر گھر سے باہر سڑک پر ہانک دیا تھا۔وہ مڑ مڑ کے اپنے مالک کے پاس جاتا تھا لیکن اسکی جوانی کے مالک نے اس کو ہر بار پیٹ پیٹ کر بھگا دیا۔کمزوری سے بیچارے کی آنکھیں بند ہو رہی تھی اور چلتے وقت اس کی ہڈیوں کے جوڑ کڑ کڑا رہے تھے۔جوانی میں اس نے اپنے مالک مہر دین کا بہت کام کیا۔مڑیل گدھا کے دل میں کئی گلے شکوے موجیں مار رہے تھے مگر پھر کیا ہوا کہ اچانک وہ ہنسنے لگا۔گدھے کا ہنسنا واقعی عجیب بات تھی۔اور اتنے مڑیل گدھے کو ہنسی کیسے آ سکتی تھی بہر حال اسکی ہنسنے کی آواز ایک آوارہ اور بیمار بیل کے کانوں میں پڑ گئی۔وہ اسکے قریب آ کر زبان حال سے گویا ہوا۔دوست تو بھی میری طرح دردمند اور ضعیف ہے شاید تجھے بھی مالک نے گھر سے نکالا ہوا ہے۔

ادھر اسکول میں بچے پریئر پڑھ رہے تھے:

''ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا''

پریئر پڑھتے وقت داڑھیوں والے ماسٹر اور ساڑیوں والی استانیاں جھوم رہی تھیں۔گویا وہ سبھی اپنے اپنے عقائد کے مطابق روحانیت کے مقدس دریاؤں میں غوطے لگا رہے تھے۔

گدھے نے کمزوری کے باوجود مسکرا کر بیل کا سواگت کیا۔۔۔اور کہا دوست چھوڑ و انسانوں کی دنیا سب فراڈ اور جھوٹ ہے۔اگر اس پر پیرّ اور تعلیم میں کچھ اثر ہوتا تو یہ اسکولی بچے اور لڑکے اپنے بوڑھوں کو اسطرح نہ ستایا کرتے۔اور ہم بھی رحم کرتے۔

گدھے نے کہا میں تو اسکولوں اور مدرسوں کے پاس سے گزرتے بھی ڈرتا ہوں۔ میں نے تو جوانی میں بھی کسی کو دولتی نہیں ماری۔اب تو مجھے اٹھنے کی ہمت بھی نہیں۔ لیکن اسکولوں کے بعض شریر بچے بچیاں اور لڑکے لڑکیاں مجھے اب بھی مجھے پتھر کنکر مارتے رہتے ہیں۔بیل نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو راستے میں آتے جاتے بعض شریر بچے بچیاں اور برے لڑکے لڑکیاں مجھ پر بھی بلاوجہ پتھر کنکر جو بھی ہاتھ چڑھے پھینکتے رہتے ہیں۔

بیل نے کہا دوست یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔ذرا آگے چل کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔یہ کہکر وہ دونوں آگے بڑھے۔ایک ایک قدم پر ان دونوں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے چھاؤں میں ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے آداب سے بیٹھ گئے۔بیل کو تھوڑی راحت ملی تو اس نے گدھے سے پوچھا دوست تم ہنس کیوں رہے ہو تھے۔

گدھے نے کہا میں فضول میں اپنے مالک سے بھلائی اور صلہ رحمی کی توقع کر رہا تھا۔اچانک مجھے اسکا ظالمانہ سلوک جو اسنے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیا تھا۔یاد آ گیا۔میرے مالک مہر دین نے اپنی ادھیڑ عمر بال بچے والی بیوی کو بلاوجہ گھر سے مار پیٹ کر بھگا دیا تھا۔دراصل اس نے ایک جوان نوکرانی سے جس سے اسکے ناجائز تعلقات تھے شادی کر لی تھی۔مجھے جب اسکی بیوفائی کی طرف دھیان گیا تو میں اپنا غم اور کمزوری بھلا کر ایک دم ہنس پڑا۔اگر مرد اپنی بیوی کے ساتھ بیس سال گزار کر بھی



اسکا نہ ہوسکا تو میرا گلہ شکوہ بے سود ہے ناں۔یہی سوچ کر اپنی ماری ہوئی مت پر ہنسی آ گئی تھی۔

اسکے بعد گدھے نے بیل سے پوچھا تیرے مالک کا کیا نام ہے۔بیل نے جواب دیا۔''دھرم چند'' اسکے بعد بیل پہلے خوب رویا اور پھر ٹھا ٹھا کر کے ہنسنے لگا۔شاید یہ ہنسی اسکی زندگی کی آخری ہنسی تھی۔

بیل نے مزید انکشاف کیا کہ جب تک وہ کھیتی باڑی کے کام کاج کے قابل تھا تو مالک اسے دانہ پانی دیتا رہا۔اور اب بیماری اور بڑھاپے کی حالت میں دھکے کھانے کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہوتا۔کاش میں مہر دین کے پاس ہوتا تو بڑھاپے میں اتنی اذیت نہ اٹھانا پڑتی اسنے مجھے کب کا ذبح کر دیا ہوتا۔اسکے بعد بیل نے کھانسنا شروع کر دیا کھانسی کے ساتھ اسکے نتھنوں سے خون بھی باہر آ رہا تھا۔

گدھے نے کہا۔کاش میں ناگالینڈ میں ہوتا تو میری جان بھی اس بڑھاپے کے جنجھٹ سے چھوٹ جاتی۔کیونکہ یہ ہندو لوگ بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی بہت سے کام کرنے لگے ہیں ان بہت سے کاموں میں گدھے کا گوشت نہ کھانا اور عورتوں کا پردہ کرنا شامل ہے۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے۔اچانک میونسپلٹی کی مردہ جانور اٹھانے والی گاڑی آ گئی۔گاڑی نے سڑک سے ہی بوم بکٹ نیچے کر کے دونوں کو مزبلہ والے بڑے ڈرم کے اندر گھسیڑ دیا۔اس طرح ان دونوں کے غم کی باتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کہی رہ گئیں۔

# مقدس بندر

(کہانی)

میرے مہان ملک میں بندروں کو مقدس سمجھ کر حفظ جان کی ضمانت دی گئی مگر بعض اوقات فرقہ وارانہ تصادم کے دوران اقلیتوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جاتا ہے۔ بہرحال میں عین جوانی سے بندروں کی حرکتیں نوٹ کرتا رہتا ہوں۔ داستانوں میں انکے کردار بھی پڑھے ہیں۔ رام جی اور راون کی لڑائی میں بندروں نے رام جی کی مدد کی تھی۔ یقیناً وہ بندروں کی مدد سے اپنی اغوا شدہ پتنی سیتا جی کو واپس لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس بھلائی کے صلے میں بندروں کے سردار ہنومان جی کو اپنی دم جلوانی پڑی۔ کہا جاتا ہے بندروں کی سرینوں کے بیچ میں آج بھی جو سرخ نشان موجود ہے۔ اسی واردات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہرحال کہا جاتا ہے سلاطین کے دور میں بندروں کو قاضی القضات بننے کا موقع بھی ملا تھا اور ایک مخصوص واردات، دو بلیوں کے جھگڑے میں اس چیف جسٹس نے پوری روٹی خود ہی کھالی تھی۔ مجھے لگتا ہے ابھی ان کے برادری کے افراد بندر بعض عدالتوں کے سربراہ بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو لوگوں انصاف نہیں مل رہا۔

بندر چوریاں بھی کرتے ہیں۔ اور سینہ زوریاں بھی۔ مقدس تیرتھ استھان۔ شہر بنارس میں یہ بندر پینٹ یا قمیص کو پکڑ کر آدمی کو روک لیتے ہیں یا پھر آگے کھڑے ہو کر کچھ کھانے پینے کی چیز مانگتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کو اچھی طرح سونگھنے کے



بعد تناول فرماتے ہیں اگر ڈبل روٹی باسی ہو تو کبھی نہیں کھاتے۔ اسی طرح ریڑی والوں کی آنکھ جھپکتے ہی کیلے سنگترے امرود جو بھی ہاتھ چڑھے لے کر ہوا ہو جاتے ہیں۔

ایک بار میرے دوست کریم صاحب کسی کے ہاں رکے ہوئے تھے۔ وہ فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ گرمیوں کے موسم میں انہوں نے رات کو کھڑکی کھول دی اور جالی شٹر کو کنڈی لگانا بھول گئے۔۔ وہ گہری نیند میں سورئے تھے بندروں کی ٹولی نے دیوار پر چڑھ کر آرام سے جالی شٹر کھولا اور انکے کمرے میں گھس آئے۔ وہاں کریم صاحب کے لئے رکھے گئے فروٹ اور جو کچھ بھی ملا کھالیا۔ اسکے بعد انہوں نے کمرے کی جامع تلاشی شروع کر دی۔ ہر ڈبے ہر بند پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ چھتیوں سے تمام سامان نیچے پھینک دیا۔ ایک الماری نیم کھلی دیکھی تو اس میں گھس کر اور کریم صاحب کے سارے کپڑے چیر پھاڑ دئے۔ شور شرابے کی آواز سے جب کریم صاحب کی آنکھ کھلی تو سات آٹھ بڑے بڑے بندر کمرے میں پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ نیم بند آنکھوں سے نظارہ دیکھتے رہے اور ڈر بھی رہے تھے کہ شاید ایک دم اٹھنے پر بندر کہیں ان پر حملہ نہ کر دیں۔ ایک بڑا بندر انکے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھا ہوا ساوگی کھا رہا ہے۔ ساوگی کا پیکٹ تو کریم صاحب کے بیگ میں تھا۔

کریم صاحب کا کہنا ہے کہ بندر کمرے سے باہر جانے کو تیار نہیں تھے۔ آخر کریم صاحب ایک دم ہمت کر کے دروازے کی طرف لپکے۔ انکا ہاتھ ٹھیک کنڈی پر پڑ گیا لیکن پیچھے سے ان کے سرینوں پر کسی بندر نے زوردار جھپٹا بھی مارا۔ خوش قسمتی سے درواز کھل گیا ان کا شور سن کر گھر والے جاگ گئے۔ وہاں موجود سب لوگ کمرے کی طرف آئے لیکن تب تب بندر جا چکے تھے۔

سبھی افراد خانہ کریم صاحب کے دریدہ دامن کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ان کا دامن

بھی یوسف کی طرح پچھلی طرف سے پھٹا تھا البتہ یوسف کا دامن زلیخا نے عشق میں مبتلا ہوکر پھاڑا تھا اور کریم صاحب کا دامن مقدس بندروں نے کیا پتہ کس لئے پھاڑا تھا......؟



# خراٹے

(علامتی کہانی)

لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں خراٹے مارتا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں میں نے اپنے خراٹے کبھی نہیں سنے۔اس لئے لوگوں کی باتوں پر میں زیادہ کان نہیں دیتا۔لیکن یہ سچ ہے کہ لوگوں کے خراٹے مجھے بہت برے لگتے ہیں۔سوچتا ہوں گہری نیند کا یہ کیسا لطف ومزہ ہے کہ اسکا تمتع و فائدہ اٹھانے والا کسی دوسرے کو فیضیاب ہوتا نہیں دیکھ سکتا ہے۔خراٹے مارنے والا عجیب وغریب ذی حق اور نرالا منافع خور ہیں۔ یہ قدرت کی نیرنگی نہیں تو اور کیا ہے۔۔لوگوں کی بات کو چھوڑو......

میرا ایک دوست ہے جو کہ مجھے جان سے پیارا ہے۔شرع شریف کے مطابق اسکی سانسوں کا میری سانسوں سے گھل مل جانا روا ہے۔لیکن سچ بتاؤں تو ہم بیک وقت اکٹھے سو ہی نہیں سکتے۔اس لئے ہم دونوں باری باری سوتے ہیں۔کیا مجال ہے کہ ایک شیر کے گرجتے ہوئے دوسرا شیر آرام سے سو سکے۔

پچھلے تیس سال، جب سے میں اس دوست کی رفاقت سے سرفراز ہوا ہوں اور ہم ایک مقدس دھاگے سے اکٹھے باندھے گئے ہیں۔ میں پہلے پہر ہی سو جاتا ہوں یعنی مغرب کی اذان کے تھوڑی دیر بعد۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آپ مجھے پکا نمازی

سمجھنے لگیں۔ دراصل مغرب غروب کا وقت ہوتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں سورج کے ڈوبتے اور چڑھتے وقت سونا نہیں چاہئے۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ سورج کبھی ڈوبتا یا چڑھتا نہیں بلکہ ہم لوگ ڈوبتے اور چڑھتے رہتے ہیں۔خیر

دوستو! میں باری باری سونے کی بات کر رہا تھا پہلے پہر یعنی شام سے لیکر گیارہ بجے تک میں سوتا ہوں اور گیارہ بجے جونہی وہ شیر نژاد بستر پر پہلو دراز کرتا ہے......تو زور زور سے گرجنا شروع کر دیتا ہے۔میری کیا مجال کہ گرجتے شیر کے کچھار میں سوسکوں۔ گویا میں اور میرا محبوب ایک دوسرے کے راز دار ہونے کے علاوہ پہریدار بھی ہیں۔ کیا مزیدار زندگی ہے ہماری۔

میرے دوست کا کہنا ہے کہ آپ بہت رنج آور اور تکلیف دہ خراٹے مارتے ہو جب کہ مجھے یقین نہیں آتا کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے جب تک کوئی بات اپنے کانوں سے نہ سنو اس پر یقین کرنا درست نہیں۔ میں نے دوست سے کہا جب میں زوردار خراٹے مار رہا ہوتا ہوں تو مجھے تم جگا دینا تاکہ اپنے خراٹے کی آواز سن کر مجھے یقین آسکے۔ بارہا میرے دوست نے مجھے جگایا لیکن میں اپنے خراٹے کی آواز سننے میں کامیاب نہ ہوسکا الٹے ہی ہر بار جھگڑا ہوجاتا رہا۔

ایک دن میری فرمائش پر میرے دوست نے جب میرے خوفناک خراٹوں کی آواز ٹیپ کر کے مجھے سنائی تو میں ڈر گیا اور میں نے صاف انکار کر دیا یہ میرے خراٹوں کی آواز ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ دراصل یہ آپ کے خراٹوں کی آواز ہے۔ کافی جھگڑا ہوا بحث وتمحیث میں گواہ پیش کئے گئے۔ گواہ بھی گھر کے ہی تھے۔ سوچ وچار کرنے پر پتہ چلا کہ سب انسانوں کے ان بدصفت خراٹوں کی آواز تقریباً ایک ہی جیسی ہوتی ہے ۔اور خراٹے دراصل نیند کی لذت ہیں۔ آدمی اپنی لذت محسوس کرتے ہوئے دوسرے آدمی کی لذت سے بے خبر ہوتا ہے۔ اور اسکا الٹ بھی صحیح ہے یعنی تکلیف اٹھاتے



ہوئے آدمی کی تکلیف سے دوسرا آدمی انجان ہوتا ہے۔

خراٹے مارنے والے کی بلا سے دوسروں کی نیند میں خلل پڑتا رہے تو پڑے۔اس نے تو نیند کا لطف اٹھانا ہی ہے یعنی خراٹے مارنے ہیں۔

# جنگل کے وارث

(افسانہ)

روئے زمیں پر موجود ہر کسی کا مسکن سکڑ رہا تھا۔قدرتی وسائل کی کمی ہو رہی تھی۔

لیکن جنگل کے متصل آبادالن اور دوسرے زمینداروں کی اراضی ہر سال بڑھ رہی تھی۔انکی پیدا کرنی اراضی میں جنگل سے ہوا کے ذریعہ اڑ کر آنے والے خودرو پیڑ پودوں کے بیجوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ ہر سال گھاس کی زمین پر ایک نرسری سی اگ آتی تھی۔پچھلی برسات میں جو ننھے پیڑ پودے کاٹنے سے بچ گئے تھے وہ کافی بڑے ہو چکے تھے۔

سردیوں میں دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز جنگل الن کی مینڈھی سے رنگی داڑھی جیسا سرخ ہو چکا تھا۔

اچانک الن کا خیال جنگلی جانوروں کی طرف گیا۔جو الن اور دیگر کسانوں کے ہاتھوں سکڑتے ہوئے مسکن طبعی کو لے کر سخت پریشان تھے اور کبھی کبھی انتقاماً۔ان کسانوں کی فصلوں پر دہاڑ امار کر سخت نقصان پہنچاتے تھے۔

الن نے ہر سال پیش آنے والی مشقت کے بارے میں بھی سوچ کر سر پر ہاتھ پھیرا اور مکروہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسکے پیلے دانتوں کی بدبو دور تک فضا میں پھیل گئی۔



اسی دن الن نے پہاڑی چوٹی کے اطراف میں بسنے والے کسانوں سے کانا پھوسی کی۔

اکتوبر کی خنک رات میں جنگل کو ہر طرف سے آگ لگا دی گئی تھی۔جانوروں نے چوٹی کا رخ کیا۔لیکن آگ کا سیلاب ہر طرف سے انکا پیچھا کر رہا تھا۔خطرے کی صورت میں بھاگتے وقت سانپ اور نیولا اپنی جبلی دشمنی بھول چکے تھے۔خوف زدہ شیر ہرنوں میں چھپ رہا تھا۔

قحط اور غدر کا ماحول تھا۔

جانوروں کی ٹولیاں پہاڑی کی چوٹی پر پہنچی اپنے مسکن طبعی کو آگ میں گھرے دیکھ کر آسماں کی طرف منہ کر کے رونے لگیں۔

پہاڑی کی چوٹی کے اطراف میں بسنے والے سب کسان جنگل میں لگی آگ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔کلیساؤں میں پادری دعائیں کر رہے تھے۔

’’خداوند جنگلی جانوروں کا تخم مٹا دے کیونکہ جنگلی جانور وغیرہ کے مٹنے یا مرنے سے فصلوں اور پھلوں سے انکو ملنے والی سوغات اور عشر کا حصہ بڑھنے کی امید تھی۔

لیکن دیکھو کیا ہوا۔خداوند نے مکار پادریوں کی نہیں سنی۔ایک بھی نہیں لیکن جنگلی جانوروں کی فریادوزاری سن لی۔اچانک بادل پھٹ گئے۔جنگل کا بیشتر حصہ بچ گیا اور زیادہ تر جنگلی جانور بھی۔

لیکن کسانوں کی ننگی اراضی بڑی پسیوں، پھسلن اور رپٹن کی زد میں آ گئی...... ہر طرف سیلاب کا ریلا بڑھ رہا تھا......کلیسے غرقاب تھیں۔بہت سے کسان مع اہل و عیال زمینی پسیوں (Land, Slides) میں دب کر مر چکے تھے۔

خداوند نے جنگلی جانوروں کی فریاد سن لی اور انہی کو جنگل کا وارث قرار دیا۔

# پھر اسلام آ گیا اور

(کہانی)

ایک بوڑھی میراثن اپنی پرانی سارنگی کو لے کر حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ اجمل اس کے پاس جا بیٹھا اور بولا...... کچھ بول سناؤ...... میراثن نے جواب دیا جو بوڑھی اور کمزور بھی ہو چکی تھی۔ لمبی سانسیں بھریں اور تھوڑی توانائی حاصل کر کے اپنے بول سارنگی بجاتے ہوئے سنانے شروع کئے۔ بیچ بیچ میں جب اسکی سانس پھول جاتی تھی تو رک جاتی تھی۔ اور وہ کافی دکھی اور پریشان حال بھی تھی۔

اجمل نے اسکی زبوں حالی کی داستاں چھیڑی تو میراثن نے پھوٹ پھوٹ کر کہا ہم لوگ میراثی ہیں ہمارا کام لوگوں کو خوش کر کے خوشی حاصل کرنا تھا ہم راجوں کے دربار سے لے کر عام لوگوں کی تقریبوں کے موقع پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ہر دن ہمارے لئے شادی کے دن جیسا تھا اور ہر رات ہمارے لئے موجب ہزار خوشی تھی۔ ہم لوگ آسودہ تھے اور ہماری اولادیں بھی مرفحہ حال۔ ہمارا فن بھی روز بروز ترقی پذیر تھا۔ صدیوں سے ایسا چلا آ رہا تھا۔ ہمارا فن ہی ہماری جائیداد تھا۔ اور روزگار بھی۔ اسکے بعد اسکی آواز گلے میں رندھ گئی۔ اجمل نے کہا پھر کیا ہوا۔

لمبے سکتے کے بعد میراثن نے کہا...... پھر کیا ہوا؟ کچھ نہیں۔ یہی ناں...... پھر اسلام آ گیا۔ اور گھر گھر میں سارنگیے پیدا ہو گئے۔



# نیکی یا صلہ؟

(کہانی)

دو انجان اشخاص جن کی رگوں میں فتنہ و انتشار موجیں مار رہا تھا اور بے گناہ لوگوں کا خون بہانے کا نشہ سا چڑھا تھا۔ اپنی اپنی پیکا بندوقیں اٹھائیں اور سرحد کی طرف بڑھے لیکن سرحد پار کرتے ہی رات پڑ گئی۔ آگے اندھیری رات میں چلنا ناممکن تھا سوچا کہیں کسی کے گھر رات گزار لیں تا کہ کھانا وغیرہ بھی مل جائے۔ یہی سوچ رہے تھے کہ انہیں دور ایک مکان کے روزن سے پھوٹتی ہوئی مدھم سی روشنی نظر آئی وہ اس طرف تیزی سے بڑھے۔ اور وہاں پہنچ کر زور زور سے دستکیں دینے لگے...... بہانک دستکوں کی آواز سنتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ وہاں رہ رہی زینت کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جرأت کر کے پوچھا: کون ہو اور یہاں اس وقت کیوں آئے ہو؟ ۔ باہر سے آواز آئی ''ہم مجاہد ہیں......'' رات گزارنی ہے۔ عورت نے کہا میرا شوہر گھر سے باہر فوج میں نوکری کرتا ہے۔ لہذا آپ تھوڑا آگے بستی میں کسی اور کے گھر چلے جاؤ۔ لیکن انہوں غصے سے کہا۔ ہم آگے نہیں چل سکتے۔ اور سختی سے دروازہ کھولنے کو کہا...... زینت نے ڈر کر دروازہ کھولا اور وہ اپنے پوچ اور اسلحہ کھول کر آرام سے بیٹھ گئے انہوں نے زینت سے کچھ کھانے کو مانگا...... کھانا کھلا کر زینت اور اس کا بیٹا دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ماں بیٹا سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ انجان اشخاص

نے انکے کمرے کے دوازے پر دستکیں دینا شروع کر دیں۔عورت نے گھبرا کر پوچھا کیابات ہے کیوں۔؟

ان میں سے ایک نے کہا۔

''اپنے لڑکے کو ہمارے پاس بھیج دو۔رات ہم اسکے ساتھ گپ شپ ماریگا'' یہ سنتے ہی زینت کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔اور ساتھ ہی سب سمجھ گئی کہ یہ لوگ اسکے نوخیز لڑکے کو کیوں اور کس لئے بلا رہے ہیں۔زینت خاموش ہوگئی جب دستکوں کی آواز بڑھنے لگی تو زینت لمبی سانس بھرکر۔گہری سوچ میں ڈوب گئی۔یہ کون اور کیسے لوگ ہیں؟

دستکوں کو زور پکڑتے دیکھ کر وہ ڈر گئی اور کہنے لگی۔

''چلو میں خود ہی آجاتی ہوں'' اسکے تھوڑی دیر بعد دستکوں کا شور آہوں میں بدل گیا۔



# شرابی

(کہانی)

سردار جی عام پنجابیوں کی طرح زندہ دل تھے طنز ومزاح انکی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔بات بات سے نئی طرحدار بات نکالنا کوئی ان سے سیکھتا۔ٹھیٹھ پنجابی پونچھی پہاڑی میں کیا خوب شعر کہتے تھے۔اردو ادب سے بھی کچھ راہ ورسم رکھتے تھے۔

چوڑی دار پاجامہ جو کہ ٹخنوں کی طرف بہت ہی تنگ اور اوپر کمر کی طرف اسکا گھیراؤ شلوار کی طرح پھیلا ہوا کرتا تھا۔لمبا سا سفید کرتا، کھلی آستینیں، روایتی پگڑی آگے سے اوپر اٹھی ہوئی اور پچھلی جانب سے گردن کو ڈھکے ہوئے رہتی تھی۔میں نے قریبی دوست ہونے کے باوجود انکے کان کبھی نہیں دیکھے تھے۔میرے دل میں اکثر انکے کانوں کے متعلق یہ بچوں جیسا سوال جنم لیتا رہتا تھا۔لیکن ادب کے خلاف سمجھتا کہ انکو کبھی یہ پوچھوں۔''سردار جی آپکے کان کہاں ہیں......؟''

سیر کے لئے کشمیر گئے تھے۔ایک ہوٹل جو ٹیلے پر تھا وہاں ایک آدھ کلومیٹر پیدل ہی چلنا پڑتا ہے۔ایک دن وہ عام راستے سے ہٹ کر ڈھلوان پر چلنے لگے تھے۔اچانک سردار جی جو پنجابی چمڑے کی نوکدار جوتی پہنے ہوئے تھے پھسل گئے اور لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرے۔انہوں نے مدد کے لئے آوازیں دیں۔کچھ مزدور کام کررہے تھے مگر وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس وقت نہیں۔کیونکہ کام ٹھیکے پر تھا۔اور انہیں بہت پرا گرس

دینی تھی۔

دوسری طرف فٹپاتھ پر چلتے ہوئے ادھیڑ عمر کے دوتین داڑھی والے بھائیوں نے سردار جی کو چوٹوں سے نڈھال اٹھنے اور چلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔تب وہ لوگ رکے لیکن سردار جی کی دکھ پریشانی سمجھے بغیر ہی کراہت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے چلے گئے......''ایم چھس سکھ، پکیو پکیو''یعنی یہ سکھ ہے چلو چلو۔چھوڑو''اور ایک لمبی داڑھی والے شخص نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''سرداد جی شراب تھوڑی پینی تھی ناں''

اسکے بعد دوتین کشمیری کیلن شیو بابوؤں۔جو اتفاق سے وہاں پہنچے تھے کو سردار جی کی حالت اور بے بسی پر رحم اور اسے ہسپتال منتقل کردیا۔بعد میں سردار جی نے مجھے کہا۔یار میں نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی پھر ان کشمیری پاپوں نے مجھے شرابی کیوں کہا تھا؟



# ہمدرد

علامتی کہانی

ہر طرف ظلم وستم کی آندھی چل رہی تھی۔اور وہ ملبے کو کرید کرید کر، دبی ہوئی کتابیں اکٹھی کررہی تھی۔ریت ہٹانے کے بعد پٹڑی کے کنارے کتابوں کا گودام برآمد ہو چکا تھا۔لیک ایک بڑے دانتوں والے چھدری داڑھی والے بھدے شخص نے اسکو جمع کی گئی اور چھانٹی گئی کتابیں اٹھانے سے منع کیا۔جب وہ باز نہیں آئی تو جاہلِ مطلق نے اس عورت کو برا بھلا کہا۔کتابیں اکٹھا کرنے کا اسے اسقدر شوق تھا کہ اس نے اپنی کم طاقتی کا اندازہ لگائے بغیر اس دہن دریدہ اور لٹکتی ہوئی زبان والے شخص کے منہ پر زوردار تھپڑ لگادیا۔

بھالو کی طرح بڑبڑا کر وہ شخص آگ بگولا ہوا اور پھر وہ تنہا عورت پر ٹوٹ پڑا۔اس بےرحم اور وحشی نے پہلے تو اس کے ہاتھوں کو بری طرح مروڑا اور چبھایا۔اسکے بعد اس کو بڑی بےرحمی سے مارا پیٹا۔یہاں تک کہ وہ بیہوش ہوکر گرگئی۔کسی رحمدل دلیر انساں نے ہمت کرکے اس نیم مردہ باذوق عورت کو اٹھاکر قریبی معالج کے پاس لیا......

معالج نے معائنہ کے بعد کہا اس کا بچنا محال ہے کیونکہ قلبی حرکت بند ہوچکی ہے۔ تاہم جسم ابھی تھوڑا گرم ہے۔

معالج نے اس کی موت کی تصدیق کے بعد اس کا پیٹ چاک کردیا۔اور اسکے پیٹ سے ایک زندہ بچی نکالی۔

اس نومولود بچی کا کوئی وارث نہیں تھا۔معالج نے رحم کھا کر اس کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔یہی بچی معالج کے گھر میں ناز وادا سے بڑی ہوئی اور پڑھنے لکھنے کے بعد حفظان صحت کی ترجمان اور خادم ملت بنی۔

ظلمتوں کے سائے میں پلتے رہے اطفالِ نور
پتھروں کے شہر میں ہوتی رہی شیشہ گری

اس معالج کا نام حکیم اجمل خاں صاحب تھا اور اس عظیم بیٹی کا نام ''ہمدرد'' جو آگے چل کر، عروج پر پہنچ کر پچھڑے ہوئے طبقے کے خاصے افراد کے لئے مفرح ثابت ہوئی۔



# طلسماتی دنیا کا راز

علامتی کہانی

اس نے کیسری رنگ کی خوبصورت کرتی زیب تن کی ہوئی ہے لگتا ہے کہ پامپور کشمیر کے کیسری کھیتوں سے لیکر پنجاب تک آنکھوں کے آگے کیسر ہی کیسر ہے۔سدا بہار صنوبر جیسا وہ بدن۔شاخ سبز جیسے بازوؤں پر۔وہ کیسری کرتی بیساکھ میں پھولی ہوئی سرسوں کا منظر پیش کرتی ہے۔اس کرتی کے اوپر والے بٹن کھلے ہیں اور چاک سے چندر بھاگا (چناب) ندی جیسے سفید سینے کی جھلک دیکھ کر میرا دم سینے میں اٹک سا جاتا ہے۔

اس نے گلے میں ایک سو آٹھ منکوں والی وہ مالا جسے رشی منی ہزاروں برس جپتے رہے،شوق سے اپنے گلے میں پہنی ہے۔اور اس مالا کی اک طرف کو اس نے کھینچ کر شہادت کی انگلی پر اٹکایا ہوا ہے۔ مالا کے منکے ہیں یا بکھرے ہوئے آسمانی تارے جنہیں اس نے وحدت ومحبت کے دھاگے میں پرولیا ہے۔اس کی شہادت کی وہ کھڑی انگلی عربی الف کی طرح مجھے خوشنما لگتی ہے۔اسے دیکھ سن کر میری سماعت جاگ اٹھتی ہے اور میں ان سنی سننے لگتا ہوں انکہی کہنے لگتا ہوں اور ان دیکھی دیکھنے لگتا ہوں۔کبھی تو وہ وید منتر ''اک اوم دو تیونا ستے'' پڑھ رہی ہوتی ہے......یعنی لا الہ الا اللہ......

اس من موہنی مورت سے میں نے اجازت لے کر اسکے یہ خدوخال، امر جیونی بوٹیوں کے رنگوں میں گھول کر زمینی طبقوں پر لکھتا رہا ہوں۔اسی لئے میری اس تحریر

کا حرف حرف سولہ سنگھار کیئے ہوئے ہے۔

سالہا سال سے اس کا سراپا میرے آگے پیچھے دائیں بائیں چلتا پھرتا رہا ہے۔اور پھر وہ خود حرفوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔اب میرے لئے حرف منظر ہے اور منظر حرف۔

اس مایا روپی کی گردن ہے یا حافظ وخیام کی صراحی کا گلا......اسکی کھلی زلفیں ہیں یا برہمانڈ پر پھیلی ہوئی چڑھتے ہوئے سورج کی نقرئی کرنیں۔اسکے باریک اور شوخ خدو خال دیکھ کر مجھے بہزاد و مانی کی نقاشی یاد آتی ہے جب جب میں غرق نظارہ ہوتا ہوں تو میں افق خیال پر دیکھتا ہوں کہ آرٹ گیلری میں مونولیزا کی یادگار بھی دم توڑ بیٹھتی ہے۔اللہ اللہ

کلاہِ کوہ جیسا اس کے بلند سر، جو ولیوں کی خانقاہ سے بڑھ کر میرے لئے مقدس ہے کے عین اوپر، بیچ میں آدھے بالوں کا جوڑا ارام جی سے خراج مانگتا رہتا ہے۔ تھوڑا نیچے دیو مالائی ونوری چہرہ، روز وشب جیسی سفید وسیاہ آنکھوں پر آفتاب سرما کی دھوپ جیسا پیارا چشمہ۔ایک کان میں کنڈل رہتا ہے اور دوسرے کان سے دوسرا کنڈل اڑ کر ہر پہلی تاریخ کا چاند بن جاتا ہے اور اسکے ماتھے سے چمکتی بندیا ہر روز شام کو کالے سمندر میں گر جاتی ہے۔اور پھر رات کے وقت، پھولی ہوئی روئی کے کھیت جیسی خوبصورت حسینہ جھک کر وہ روشن بندیا اٹھاتی ہے اور پھر اپنی مٹھی بند کر لیتی ہے۔ہر رات وہ تارے پھانکتی رہتی ہے۔صبح پھر اپنی مٹھی سے چمکتی ہوئی بندیا نکال کر جب اپنی جبین پر سجاتی ہے تو سارے عدم کو دوبارہ وجود مل جاتا ہے۔شب و روز میرے آگے یہ تماشا جاری رہتا ہے۔لوگ کہتے ہیں وہ حسینہ مرچکی ہے لیکن میں کہتا ہوں نہیں نہیں وہ ہر وقت میرے سامنے زندۂ جاوید ہے اور دیکھنے والوں کو ان گنت کرشمے اور بے شمار نظارے دکھاتی رہتی ہے۔میری نظروں میں یہ وسیع کائنات اور اس میں تمام موجودات اسکے طلسماتی آئینے ہیں۔وہ طلسماتی دنیا کا راز۔



# بے دماغ گدھا

## (کہانی)

(خیال ماخوذ از ایسپ: داستان سرا وقصہ گوئے قدیم یونان)

ایک بوڑھا اور کمزور شیر کسی غار میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔اور ادھر ادھر سے اکٹھی کی گئی ہڈیاں چبھا رہا تھا...... کیونکہ وہ اب تازہ شکار نہیں کرسکتا تھا۔لومڑی کو اسکی حالت پر رحم آ گیا۔لومڑی نے کہا۔آپ نے مجھ پر بہت احسان کیے ہوئے ہیں اس لئے میں آپ کے لئے بھلا پھسلا کر کوئی شکار لاتی ہوں......لومڑی نے کئی جانوروں کو طرح طرح کے بہانے کر کے شیر کے پاس لانا چاہا مگر کوئی آنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔آخر لومڑی گدھے کے پاس گئی اور کہنے لگی۔شیر بوڑھا ہو گیا ہے اب وہ بادشاہی نہیں چلا سکتا۔آپ چلو اور اس سے بادشاہی کی مہر اور دستاویز لے لو اس طرح تم اسکے مرنے بعد بادشاہ بن جاؤ گے۔گدھے نے کہا یہ کیسے ممکن ہے۔لومڑی نے کہا بادشاہی نظام میں ایسا ہی ہوتا ہے......وقتی بادشاہ جسے چاہے اسکو ہی اپنا جانشین مقرر کرسکتا ہے۔

گدھے کو مشورہ پسند آیا اور وہ لومڑی کے ساتھ غار میں پہنچا شیر نے گدھے کو قریب دیکھتے ہی جھپٹا مارا مگر شیر کا پنجہ اچھی طرح جم نہیں سکا تھا لہٰذا گدھا بھاگنے میں کامیاب ہو گیا......

کچھ دن بعد لومڑی پھر گدھے کے پاس آئی۔ گدھے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا: موسی جی! تم تو مجھے شیر سے مروانے کے لئے لے گئی تھی۔

لومڑی نے کہا توبہ توبہ۔ میں اور اس قسم کی چالا کی۔ اور پھر تمہارے جیسے شرافت کے پیکر کے ساتھ اس قسم کی مکاری اور دھوکہ دہی۔ ہرگز نہیں۔ پیارے بھانجے میں تو چاہتی ہوں کہ شیر کے مرنے کے بعد تمہیں ہی اس جنگل کی بادشاہی ملے۔ لومڑی نے جب قسمیں کھا کھا کر کہا۔

اور یقین دلایا کہ شیر نے تو تمہاری پیٹھ پر فقط اپنی مہر ثبت کی تھی شیر کی مہر اسکا پنجہ ہے۔ ظاہر ہے اتنی بھاری مہر لگتے وقت تمہیں تھوڑی تکلیف تو ہوئی ہوگی ناں۔ گدھے نے آنسو ٹپکاتے ہوئے کہا۔ بڑی سخت اور بھاری مہر تھی شیر کی۔ لومڑی نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوکر گدھے کے آنسو پونچھے۔ اور کہا۔ میرے پیارے پیارے بھانجے!

اب تو صرف شیر سے دستاویز دینا لینا باقی ہے۔ تھوڑی حیل و حجت کے بعد گدھا لومڑی کی باتوں میں آ گیا۔ اور لومڑی کے ساتھ ساتھ دوبارہ شیر کی غار میں جا پہنچا۔ غار کے دہانے پر کووں اور چیلوں کو منڈلاتے دیکھ کر گدھا سمجھا۔ واقعی یہ سبھی صحافی لوگ ہیں اور سب آج یہاں مجھے بادشاہی کی دستاویز تھمانے کی تقریب میں آئے ہیں۔ جونہی گدھا غار میں پہنچا اب کی بار شیر نے اپنی باقی ماندہ پوری قوت کو مجتمع کر کے گدھے پر حملہ کیا اور گدھے کی گردن اس کے دانتوں میں آ گئی۔ شیر نے گدھے کو مار کر اس کے کلیجا جگر وغیرہ کھا لئے۔

گدھے کو مارنے اور اسکا ماس کھانے کے بعد شیر کو پیاس لگ گئی تھی اس نے لومڑی سے کہا تم شکار کا دھیان رکھنا۔ میں دریا سے پانی پی کر آتا ہوں۔

موقع فراہمی کسی کو بھی چور بنا سکتی ہے



شیر کی عدم موجودگی میں لومڑی نے گدھے کی کھوپڑی سے دماغ ہی نکال کر کھا لیا۔

شیر نے واپسی پر گدھے کی کھوپڑی سے جب دماغ نکال کر کھانا چاہا تو اسے غائب پایا اور اس نے لومڑی سے پوچھا اس کا دماغ کہاں گیا۔؟

لومڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا حضور اس گدھے کی کھوپڑی میں دماغ نام کی شے تھی ہی نہیں۔

شیر نے کہا وہ کیسے؟

لومڑی نے کہا۔ حضور اگر اس گدھے کو دماغ ہوتا تو یہ دوسری بار آپ کے پاس نہیں آتا۔ معقول جواب سنتے ہی شیر کو یقین آ گیا کہ گدھے کو دماغ ہی نہیں تھا اور لومڑی وہاں سے دم دبا کر بھاگ نکلی۔

# دو چمتکار

(کہانی)

گپھا میں بیٹھے ہوئے چیتے سے چیتنی ناراض تھی اور اسکی کوئی بات نہیں مان رہی تھی۔ چیتے نے چیتنی سے کہا۔ڈارلنگ آؤ۔ میں تمہیں ''دو چمتکار'' دکھاتا ہوں۔

چیتنی نے ہنستے ہوئے کہا کہ شریک حیات ہونے کے ناطے میں تمہارے سارے چمتکار اچھی طرح جانتی ہوں۔

چیتے کی غیرت جاگ اٹھی اس نے اپنے جسم کو سکیڑنا شروع کر جلد ہی بہت چھوٹا ہوگیا۔چیتنی سے کہا اب کیسا لگتا ہوں؟چیتنی نے کہا اسوقت تم بلی جیسے لگتے ہو؟

اسکے بعد چیتے نے اپنا جسم پھیلانا شروع کیا اور جلد ہی بہت بڑا ہوگیا۔

چیتے نے پوچھا اب میں کتنا بڑا لگتا ہوں

چیتنی نے کہا۔اب تم زیبرا جیسے بڑے لگتے ہو۔

چیتے نے کہا اب تم میرا دوسرا چمتکار دیکھنا۔

میرا منہ لہولہان۔اور میری آنکھیں دہکتے انگاروں کی طرح سرخ ہوں گی۔

اسکے بعد چیتے نے چھلانگ لگائی اور بہت تیزی سے جھپٹ مار کر تھوڑی دوری پر چرتے ہوئے ایک جنگلی گدھے کو مار گرایا۔اور اسکا خون وغیرہ پی لیا۔اسکے بعد چیتا



چیتنی کے سامنے آ کر کہنے لگا۔

اب میرا چہرہ کیسا لگ رہا ہے۔؟

چیتنی اسے دیکھ کر ڈر گئی اور کہنے لگی۔واقعی تمہارا منہ لہولہان ہے اور تمہاری آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہیں۔اسکے بعد چیتنی نے دم ہلاتے ہوئے اپنا پچھواڑا چیتے کے سامنے رکھ دیا۔

چیتے کے ان ''دو چمتکاروں'' کی خبر سارے جنگلی جانوروں میں پھیل گئی۔اور سارے جنگلی جانور اپنے چیتے بادشاہ کے چمتکار باہم سنتے سناتے اور خوش ہوتے تھے۔

کسی کھوہ میں ایک گیدڑ اور گیدڑی رہتے تھے اکتوبر کا مہینہ یعنی انکا میٹنگ سیزن آچکا تھا لیکن گیدڑی گیدڑ کی طرف راغب نہیں تھی۔

گیدڑ نے گیدڑی کو رغبت دلانے کے لئے کہا۔

آؤ میں تمہیں دو چمتکار دکھاتا ہوں۔

اسکے بعد گیدڑ نے اپنا جسم سکیڑنا شروع کیا اور کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اس نے کہا۔

اب میں کیسا لگتا ہوں گیدڑی نے کہا۔

''بالکل ویسے ہی گیدڑ کے گیدڑ ہی لگتے ہو۔''

اسکے بعد گیدڑ نے اپنے جسم کو پھیلانے کی کوشش کی کاوش کرنے بعد گیدڑی سے پوچھا۔اب میں کیسا لگتا ہوں۔؟

گیدڑی نے۔بالکل ویسے ہی گیدڑ کے گیدڑ لگتے ہو۔

اسکے بعد گیدڑ نے کہا۔چلو اگلا چمتکار دیکھنا۔اسکے بعد گیدڑ نے دوڑ کر ایک جنگلی گدھے پر حملہ کیا۔گدھے نے مستعد ہو کر گیدڑ کے منہ پر زوردار دولتی ماردی۔بری طرح زخمی ہونے کے بعد گیدڑ اپنا جسم گھسیٹتا ہوا، گیدڑی کے پاس پہنچا اور اس سے

پوچھا اب میرا منہ کیسا لگتا ہے؟

گیدڑی نے ہنستے ہوئے کہا۔تم نے تو یہ چمتکار پورا کر دکھایا واقعی تمہارا منہ لہولہان ہے اور تمہاری آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہیں۔



قسط اول

# بلی کا اشتہار اور اعلان حج

بوڑھی بلی کے لئے اب شکار کرنا کافی مشکل ہوتا جارہا تھا۔اور شہر کے چوہے سائز میں بلی سے آدھے تو تھے ہی۔مگر طاقت ور کچھ زیادہ ہی تھے۔حملوں کے دوران کئی بار بلی کو کان کٹوانے پڑتے تھے۔ایک دن اسے شکار کی نئی ترکیب سوجھی۔اس نے جگہ جگہ اشتہار لگادیے جن میں لکھا ہوا تھا۔

''گناہوں سے توبہ کرنے والا گویا کبھی گنہگار تھا ہی نہیں۔

اگر چہ کسی گنہگار،قاتل،خون خوار نے ہزاروں قتل کئے ہوں

لیکن جب وہ صرف ایک بار زبان کی نوک ہلا کر دل کی تائید سے رو رو کر ''استغفار'' پڑھے۔تو اسکے سارے گناہ خزاں رسیدہ پیڑ کے پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں اور اس کے نامۂ اعمال میں کچی سیاہی سے لکھے ہوئے تمام گناہ بھی آنسوؤں کے چھینٹے پڑتے ہی دھل جاتے ہیں اور وہ گنہگار کورے کاغذ کی طرح بے داغ ہو جاتا ہے۔اور نومولود کی طرح معصوم۔

ہر خاص وعام چوہے کو بذریعہ اشتہار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ

اس سے پہلے جو ہوا سو ہوا۔اور ان چوہوں جو اس سے پہلے میرے پیٹ کے

دوزخ کا ایندھن بن چکے ہیں، کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہوں۔اور میں اپنے کئے پر سخت نادم ہوں اور پشیماں۔

اب ان کو اس دنیا میں دوسری زندگی تو مل نہیں سکتی۔ہاں اتنا ضرور کروں گی کہ امسال میں حج کے دوران مقام ملتزم پر جا کر انکی مغفرت کے لئے دعا کروں گی۔
میری دعا ہے کہ اللہ ان کو بہشت میں داخل کرے اور میرے قرب وجوار میں رہنے کی سعادت بخشے۔میں نے سنا ہے کہ روز قیامت ہم جیسے زاہدوں اور نکوکاروں کے طفیل گنہگار چوہے بھی بخشے جائیں گے۔

اب میں نے چوہے کھانے یکسر چھوڑ دئے ہیں۔اور میں نے پکا فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی عمر کے باقی ایام میں، میں نبات وسبزی کھا کر گزاروں گی۔ویسے بھی سادھو، سنتوں اور فقیروں نے بقالات پر ہی گزارا کیا ہے۔اور گوشت ومرغن کھانا کبھی نہیں کھایا۔

سفید چادریں جو میں نے پہن رکھی ہیں یہ میرا کفن ہے جب میں اس دار فانی سے انتقال کروں تو میری وصیت ہے کہ مجھے ان ہی سفید چادروں کے ساتھ دفن کردینا۔
میرا کوئی اہل وعیال نہیں۔صرف چوہے ہی میرے حقیقی وارث ہیں۔

میری آخری خواہش کے مرنے سے پہلے اللہ مجھے اپنے مقدس گھر کی زیارت نصیب کرے......''

اشتہار پڑھنے کے بعد چوہوں کے ہر بل میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔بعض بوڑھے چوہوں نے کہا اگر بلی ہمیں بھی اپنے ساتھ حج پر لے چلے تو ہماری دنیا تو دنیا ہے عاقبت بھی سنور جائے۔اب چوہے اطمینان سے رہنے لگے۔بعض شکی چوہوں نے بلی کے پاس جا کر بلی کی آزمائش بھی کی لیکن پہلی ہی ملاقات میں دست بیعت بلی کے ہاتھ میں دے کر واپس چلے آئے اور آہستہ آہستہ اچھی خاصی تعداد میں چوہے بلی کے مرید بھی ہوگئے۔بلی نے انہیں صبح وشام یہ ورد پڑھنے کی تلقین دی۔



باگربہ متقی مادست بیعت دادہ ایم
ما آن ملت خوش نصیبم کہ مودب ہستم
سپاس گزارم کہ یکی از چہار ملک مقرب ہستم

نوٹ

تصوف براستہ ایران ہی آیا اسی لئے کہانی کی پہلی قسط کو میں نے فارسی عبارت پر ختم کیا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے:

ہم نے پرہیزگر بلی کے ہاتھ میں دست بیعت دے دیا ہے
ہم اس خوش نصیب ملت سے ہیں جو مودب ہے۔
ہم بلی کے شکر گزار چوہے چار باشاہیوں سے بڑھ کر بلی کے مقرب خاص ہیں۔

قسط دوم

# بلی کا دوسرا اشتہار اور اصلی روپ

(علامتی کہانی)

بلی نے توبہ کر لی ہے اور یہ کہ ''اب وہ چوہے بالکل نہیں کھاتی'' اس خبر نے چوہوں کو بہت متاثر کیا۔ راتوں رات چوہوں نے چندہ اکٹھا کر کے بلی کے لئے آرام گھر بنا دیا۔

کمرے سے جڑے ہوئے غسل خانے کے علاوہ مزید گرمی سردی میں اندرونِ خانہ ہوا کی کیفیت اور حرارت وغیرہ کو حسبِ خواہش رکھنے کے لئے جدید قسم کا موسمیائہ بھی لگوادیا گیا۔

علاقے کے اسی فیصد چوہے بلی کے مرید ہو چکے تھے۔

روز مریدوں اور زائرین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بلی ائر کنڈیشنڈ آرام گاہ میں رہائش پذیر تھی۔ اور اسکے مرید سخت گرمی اور کڑاکے کی سردی میں باہر کھڑے ہو کر بلی کی آمد کا انتظار کھینچتے رہتے۔

بلی جو بظاہر زاہد بن چکی تھی اندر ہی اندر بھوک سے لاچار تھی۔ لیکن ابھی اسے کچھ روز اور صبر کرنا تھا۔



بلی کو چوہوں کا بڑھتا ہوا ہجوم اور آئے دن بے ہنگم جلوس کی شکل میں اسکی آرام گاہ پر وارد ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ اشتہار چھپوا دیا۔

''میرے پیارے مریدو! اس سے پہلے کہ میں آپکو تصوف کے چار عالموں یعنی ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت کی منزلیں طے کرواؤں۔ دن رات آپکے ہجوم اور ہر وقت تانتا باندھے رہنے سے میری ریاضت اور عبادت میں سخت خلل واقع ہو رہا ہے۔

آخر پابندی وقت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

تم لوگوں کو چاہئے کہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو بھی نبھاؤ اپنے بال بچے کا بھی خیال رکھو۔

میں نے بزرگوں سے سنا ہے۔

''تمہارے رب، تمہارے نفس اور تمہاری بیوی تینوں کا تم پر حق ہے۔''

یہ تعلیم آپ جیسے مبتدی سالکین کے لئے ہے ابھی تم عالم ناسوت میں ہو۔ جب تم میں سے صادق الوعدہ مرید میری تعلیم و تربیت اور دعا کے ذریعہ عالم ناسوت سے نکل کر عالم ملکوت میں پہنچیں گے تو ان کو کسی ظاہری مرشد کی ضرورت بھی نہیں پڑیگی۔

آپ لوگوں کا اژدھام میری ریاضت میں خوامخواہ خلل ڈالتا ہے اس لئے تم سب چوہوں کو چاہئے کہ صبح و شام منہ اندھیرے میرے سامنے سے قطار بنا کر گزر جاؤ تا کہ اس دوران میں اپنا دست تبریک تمہاری پیٹھ پر پھیرتی رہوں۔ بزرگوں کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ صدقہ خیرات کیا کرتے رہا کرو۔''

اس اشتہار کو پڑھنے کے بعد چوہے قطار در قطار منہ اندھیرے صبح و شام بلی کے

آ گے سے گزرنے لگے۔اور ساتھ ہی نذرونیاز ،غلہ اور جمع شدہ دانے وغیرہ بھی لانے لگے۔اور بلی انکی پیٹھ پر اپنا ہاتھ پھیرتی رہتی۔اور ان کے لائے ہوئے دانے وغیرہ انہی میں بانٹ دیا کرتی۔

عام چوہوں کا خیال تھا بلی بہت ہی سخی ہے لیکن انکو یہ پتہ نہیں تھا کہ لنگر والے بابے اور پیر حضرات غریبوں سے چندہ اور خیرات کے طور ملنے والے اموال کا عشر عشیر بھی واپس غریبوں پر نہیں خرچ کرتے ہیں۔یہ سلسلہ بلا ناغہ گرمی سردی، لو ہو یا برف باری، بڑے اہتمام اور شان سے چلتا رہا۔اس تبریک کے دوران بلی ہر صبح و شام، آخری چوہے کو دبوچ لیتی تھی۔اور بلی کے علاوہ اس راز کے بارہ میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

بلا ناغہ بلی ایک چوہا صبح کو اور دوسرا چوہا شام کو آرام سے شکار کر لیتی تھی اور اوپر اس کا تقدس اور ورع بھی قائم تھا۔یہ سلسلہ چلتا رہا۔دوسری طرف

چوہوں کو انکے بچھڑنے والے خویش واقارب اور عزیزوں کی گمشدگی نے پریشاں کر رکھا تھا۔انکو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انکے ساتھی چوہے کہاں غائب ہو رہے تھے۔ادھر اس طرف بلی اتنی سیانی تھی کہ وہ پنجوں سے گڈھا کھود کر اپنے پاخانہ کو بھی مٹی سے چھپا دیتی تھی۔

آخر ایک مفکر چوہے نے باقی چوہوں سے کہا:

''دوستو تمہیں کچھ خبر ہے کہ ہمارے بہن بھائی کہاں غائب ہو رہے ہیں سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔مفکر چوہے نے کہا۔

مجھے لگتا ہے کہ ہمیں قطار میں اپنے پاس بلانا بلی کی چال ہے۔یہ کہنا تھا تھا بوڑھے چوہوں نے اس مفکر چوہے کی پٹائی شروع کر دی۔اور اسکی لائبریری بھی جلا دی۔

مفکر چوہے نے نوجوانوں سے کہا:

''دوستو یہ بڈھے تو سٹھیا گئے ہیں۔تم ہی سمجھنے کو کوشش کرو: کچھ پڑھے لکھے



نوجوان چوہوں نے اسکی تائید کی اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی۔تم صحیح کہتے ہو مگر کیا کیا جائے۔؟

مفکر چوہے نے کہا:

''رسم کو توڑو''

''روایتی انداز کو چھوڑو''

اور منہ اندھیرے کے بجائے بلی کے سامنے دن دیہاڑے مشتعل جلوس کی شکل میں چلو۔

اسکے بعد چوہوں نے صبح و شام کے بجائے دن دہاڑے جلوس کی شکل میں جانا شروع کیا لیکن بلی کو یہ طریقہ اچھا نہیں لگا بلکہ سخت برا لگا۔کیونکہ اسطرح وہ شکار نہیں کر سکتی تھی۔

بلی نے چوہوں سے کہا۔افسوس تم باپ دادے کی رسم کو چھوڑ کر گمراہ ہو گئے ہو۔توبہ کرو اور پہلے کی طرح میرے پاس رسمی قطار میں آیا جایا کرو۔

لیکن چوہوں نے روزانہ جلوس کی شکل میں آنا جانا جاری رکھا۔دوسرے تیسرے دن ہی بھوک سے لاچار بلی چوہوں پر جھپٹ مار کر بے نقاب ہوگئی۔

# دیہات کی طرف مہاجرت اور بلی کے سفرحج کی تیاری

جیسا کہ کہانی کے پہلے دوحصوں میں شہر کے طاقت ور چوہوں سے بلی کے کان کٹوانے کا ذکر ہو چکا اور پھر شکار کے لئے بلی کے ڈھونگ رچانے کی ترکیب بھی بیکار ہوگئی تھی۔اس عیاری وچالا کی طشت از بام ہونے کے بعد بلی کا شہر میں رہنا مشکل بن چکا تھا۔طاقت ور چوہوں کی بڑھتی ہوئی سازشیں اور خودکش حملے کے ذریعے اڑادینے کی دھمکی نے بلی کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔اودھر صوبہ سرحد سے لے کر افغانستان تک اور ادھر بہار سے لیکر گجرات تک چوہے متحد ہو چکے تھے۔اور کچھ چوہے تو زیرزمین تنظیموں سے بھی ملے ہوئے تھے۔بلی نے خطرات کے پیش نظر دیہات کی طرف مہاجرت کا ارادہ کیا۔اسکا خیال تھا کہ شہر کے چوہے اکثر طاقت ور، پڑھے لکھے،حجتی اور بے دین ہیں۔انکے برخلاف گاؤں اور دیہات کے سادہ لوح چوہے جنکی تعلیمی شرح کم ہوتی ہے اور اپنی انپڑھتا کی وجہہ سے عقاید کے سخت پختہ ہوتے ہیں یہی وجہہ ہے کہ دیہاتوں میں پیروں فقیروں اور اللہ کے نیک لوگوں کا زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔بلی نے دل میں سوچا اقبال نے بھی تو کہہ دیا ہے:



نا م لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

دیہاتوں کے غریب لوگ خود بھوکا رہ کر پیروں اور فقیروں کو اچھا کھانا کھلاتے ہیں ان پر اموال تصدق اور اپنی جانیں نچھاور کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ویسے بھی دیہات کا صاف ستھرا ماحول صحت کے لئے بھی اچھا ہوتا ہے۔بیمار موت القریب شخص کو بھی اگر کسی صحت افزا گاؤں میں منتقل کیا جائے تو یقیناً اسکی عمر لمبی ہوجاتی ہے۔

بلی نے رات یہی سوچ وچار کرتے ہوئے گزاری۔صبح سویرے بلی نے دیہات کا سفر شروع کیا۔ ہر قدم پر اسے بڑھاپے کا احساس بھی ہوتا رہا اور بھوک پیاس کا بھی۔عربوں نے کہا سفر سقر ہے۔اور

السفر قطعۃ من العذاب۔سفر تو عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔لیکن اس سڑک کے کناروں پر سنتریوں کی طرح کھڑے پیڑ اسکا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہیترے
ہزارہا شجر سایہ دار، راہ میں ہے

جہاں چھاؤں ملی کسی درخت پر چڑھ کر ٹہنیوں کے چرخ میں تھوڑا استا لیا کرتی۔ جہاں کچھ مرا پڑا چوہا ملا کھالیا۔نالیوں سے جہاں تھوڑا پانی ملا پی لیا۔آوارہ کتوں، ماس خور درندوں وغیرہ سے سچیت اور چوکس رہ کر آخر بلی نے یہ جوکھموں بھرا لمبا سفر طے کرہی لیا۔

وہ ایک کوہستانی دیہات میں پہنچی وہاں پر موجود عالیشان مقبروں کو دیکھ کر اس کا

دل باغ باغ ہوگیا۔اس نے کئی ولیوں اور باباؤں کے درباروں اور کئی پرانی زیارتوں پر حاضری بھی دی۔ بلی کے زیارتوں پر جانے کی خبر گاؤں گاؤں میں جنگلی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ بلی نے لوڈ سپیکروں کے ذریعہ اعلان بھی کیا کہ وہ سبزی خور ہوگئی ہے۔اور آخری ایام میں معرفت کی تعلیم دینے کے لئے دور دراز علاقے سے سفر کر کے یہاں آئی ہے۔ہجرت میں برکت ہے۔اس مقولے پر بلی کو پختہ یقین تھا۔خیر یہ وعظ وپند اور اعلان ومنادی کا سلسلہ کارگر ثابت ہوا۔

دیہاتی چوہوں نے یقین کرلیا اور چند ہی دنوں میں کثرت سے اسکے مرید ہوگئے۔اسکے بعد بلی نے حج کی تیاریاں مکمل کیں۔ساتھ میں کثیر التعداد چوہے بھی حج پر جانے کے لئے تیار ہوگئے تھے لیکن بلی نے چوہوں کو سفر کی مشکلوں کے متعلق آگاہ کیا اور اعلان کیا۔

ا بکی بار حج میں وہ صرف اٹھارہ سو تندرست وتوانا اور اہل ثروت چوہے جن پر سفر فرض ہے کو اپنے ساتھ لے جائیگی اور قیامت کے دن جب اٹھارہ جنتی دروازے کھولے جائیں گے تو وہ ہر دروازے میں سے اپنے ایک ایک سو مرید چوہوں کو جنت میں داخل کروائے گی۔قیامت کے دن بے شک علماء راسخین اور عابدین وزاہدین کے علاوہ حجاج کرام کو بھی شفاعت کے ''پاور آف اٹارنی'' Power of attorney دئے جائیں گے۔

اسکے بعد اسنے حج کے پروگرام کو حتمی شکل دی۔بلی نے چوہوں سے کہا کہ تم اٹھارہ سو چوہے ایک لمبی قطار بنالو۔سب سے بڑا اور طاقت ور چوہا آگے رہے اسکی دم کے پیچھے دوسرا۔ پھر تیسرا پھر چوتھا۔اور پھر اسی طرح آخری چوہے تک. عازمین چوہوں کی اس لمبی قطار میں سب سے پیچھے بلی نے رہنے کا فیصلہ کیا۔عجیب امیر کارواں تھی یہ بلی بھی۔آخر یہ طائفۂ عازمین بڑی آن بان سے سفر پر نکل پڑا۔بلی نے چوہوں کو سختی



سے ہدایت دی ہوئی تھی کہ راستے میں یہ قطار قائم رہنی چاہئے۔نماز کے وقت اسی طرح قطار میں رو بہ قبلہ ہوجاتے اور بلی انہیں نماز بھی پڑھا لیتی۔گویا قطار چند منٹوں کے لئے صف میں تبدیل ہوجاتی۔پھر یہ صف بندی قطار میں تبدیل ہوجاتی۔اسی طرح انکا یہ لمبا سفر مسلسل جاری رہا۔

بلی نے سفر کے دوران ساڑھے چار سو پڑاؤ کئے اور ہر پڑاؤ پر صبح وشام بلا ناغہ وہ آخری چوہے کو چپکے سے دبوچ کر کھالیتی تھی۔چونکہ چوہے قطار میں تھے انکا دھیان آگے سفر اور مناظر پر تھا۔ پڑاؤ پر چوہے رات کو ادھر ادھر ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ کھا لیتے تھے۔پھر صبح کے بلی سیٹی سنتے ہی قطار کی صورت میں ''فالن'' ہوتے ہی سفر شروع ہوجاتا تھا۔انہیں اپنے پچھلے ساتھیوں کے بارہ میں کوئی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔اس لیے بیت المقدس پہنچنے تک نو سو چوہے وہ کھا چکی تھی۔باقی نو سو حج کرنے والے چوہوں کی قطار، بلی کے سفر واپسیں میں کام آئے۔آخر کار بلی حج کرنے بعد خیر وعافیت کے ساتھ اچھی موٹی تازی ہوکت واپس اپنے وطن مالوف میں پہنچ گئی۔

# شیر کی صحبت بدل سکتی نہیں گیدڑ کو

(کہانی.....خیال ماخوذ)

طبعی میلانات اور فطری رجحانات بدلے نہیں جاسکتے یہ حقیقت ہے کسی حد تک صحبت کا اثر مرتب ہوتا ہے۔لیکن جدی پشتی چور کے بچے کو صالح بنانا شاید آسان نہیں۔ یہ صحبت کے متعلق پرانے مفروضے بچوں کی تربیت کے معاملے میں ایک حد تک صحیح ہوسکتے ہیں لیکن کوئی اصول کلی بھی نہیں۔ایک ہی نسل کے اندر صحبت کا اثر مرتب ہوتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالع ترا طالح کند

مگر یہ مفروضے مخالف نسلوں پر نہیں استعمال کیے جاسکتے ہیں.....کوے کا بچہ کوئلوں میں رہ کر کبھی کوئلوں کی عادتیں نہیں اپنا سکتا......اسی طرح شیر کا بچہ انسان کی صحبت میں رہ کر انسانی اوصاف کا حامل نہیں ہوسکتا۔اسی حقیقت کی طرف یہ حکایت رہنمائی کرتی ہے۔پرانے زمانے کی بات ہے۔کہا جاتا ہے۔

کہ ایک شیر اور شیرنی کسی غار میں رہتے تھے

شیر روزانہ کچھ نہ کچھ شکار کر کے اپنے چھوٹے بچوں کے لئے لاتا تھا اتفاق سے ایک دن اسے کوئی شکار نہیں ملا واپسی پر اسے گیدڑ کا ایک بچہ ملا۔اس نے اسے زندہ ہی



اٹھا کر شیرنی کے حوالے کر دیا۔شیرنی نے کہا اس ننھے سے گیدڑ کے بچے کو تم نے نہیں مارا تو میں دو بچوں کی ماں کیسے مار سکتی ہوں؟ لہٰذا شیر اور شیرنی نے اس گیدڑ کے بچے کو بھی پالنے کا فیصلہ کرلیا۔بہت چھوٹا تھا اس لئے وہ گیدڑ بچہ بھی کسی حد تک شیر بچوں سے گھل مل گیا اور تینوں ایک ساتھ بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔شیر اور شیرنی نے اپنے بچوں کی طرح اسکی بھی دیکھ بال شروع کردی۔خاص کر شیرنی گیدڑ بچے سے کسی قسم کا ناروا سلوک نہیں کرتی تھی۔ بلکہ گیدڑ کے بچے کو یتیم سمجھ کر خصوصی توجہ دیتی تھی۔لیکن بڑے ہونے پر انکی حرکتیں آپس میں میل نہ کھاتی تھیں کیونکہ گیدڑ بچے کی جبلتیں اور عادتیں شیر کے بچوں سے قدرے مختلف تھیں۔شیر اور شیرنی انکی عادتوں کو غور سے دیکھتے اور جانچتے رہے۔کھیلتے وقت کئی بار ان میں نوک جھونک ہوجایا کرتی تھی۔لیکن شیرنی ماں گیدڑ بچے کا دھیان رکھتی تھی۔

ایک دن وہ تینوں بچے غار کے باہر کھیل رہے تھے وہاں ایک ہاتھی کا گزر ہوا۔شیر بچوں نے کہا چلو مل کر ہم تینوں اس بڑے دشمن پر حملہ کرتے ہیں لیکن گیدڑ بچے نے کہا...... نہیں یہ ہمیں مار ڈالے گا لہٰذا چلو بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ کہتے ہی گیدڑ بچہ بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھا ہانپتا کانپتا ہوا شیرنی ماں کے پاس پہنچا۔ بہادر شیر بچوں نے آگے بڑھ کر ہاتھی پر حملہ کیا اور اسے بھگا دیا۔

نوجوان شیر بچوں کو اپنے بھائی گیدڑ بچے کی یہ بزدلانہ حرکت بہت ہی معیوب اور خلاف آئین محسوس ہوئی اور اس بار انہوں نے شیرنی ماں سے شکوہ بھی کیا۔ بلکہ انہوں نے گیدڑ بچے کو طعن و تشنیع کا ہدف بھی بنایا۔طعن و تشنیع سن کر گیدڑ بچے کو غصہ آگیا اور وہ بھبھکیاں مارنے لگا۔گیدڑ بچے نے شیرنی سے مخاطب ہو کر کہا۔

’’میں ان دونوں سے کسی طرح کم نہیں مسئلہ بہادری کا ہو یا تعلیم و ذہانت کا۔ شیرنی ماں تم ان کی طرف داری کیوں کرتی ہو؟‘‘ دیکھو ان دونوں نے میرا بے جا

مذاق اڑایا ہے میں نے عہد کر لیا ہے کہ میں کسی حیلے بہانے سے ان دونوں کو مارڈالوں گا۔میں اپنی ہتک عزت کا ہر حال میں ان دونوں سے بدلا لے کر رہوں گا۔‘‘

شیرنی ماں نے گیدڑ بچے کو بہت سمجھایا کہ یہ دونوں شیر بچے تیرے رضائی بھائی ہیں لیکن گیدڑ بچہ مزید جوش میں ہوش کھو بیٹھا۔

سچ ہی کہا گیا ہے کہ کمینے لوگوں کے ساتھ اگر عاجزی سے پیش آیا جائے تو وہ اور بھڑک اٹھتے ہیں جبکہ شریف اور نجیب لوگوں سے عاجزی کے ساتھ پیش آنے پر وہ مزید نرم اور ملائم ہو جاتے ہیں۔

اسکے بعد شیرنی کو پتہ تھا کیا کرنا ہے اس نے گیدڑ بچے سے کہا میرے بیٹے یہ سچ ہے کہ تم کسی سے کم نہیں ہو لیکن تم ہو تو آخر ایک گیدڑی کے بچے۔اور تم گیدڑ کی طرح ہی سوچو گے۔کیونکہ تمہاری فطرت ہی کچھ ایسی ویسی ہے۔کئی سال پہلے میں نے تم پر رحم کھا کر اپنا دودھ پلایا اور اپنے بچوں کے ساتھ تجھے بھی پالا پوسا۔

تم کتنے احسان فراموش ہو اور اب ذرا سی بات پر انتقام کی بات کرتے ہو اس سے پہلے کہ تم انتقام کے بارے میں سوچو۔اور میرے غصے کا نشانہ بنو۔یہاں سے بھاگ جاؤ۔

اسکے بعد شیرنی نے زور دار گھرج ماری۔اسطرح گیدڑ بچے کو اپنی اوقات یاد آ گئی۔مزید شیرنی نے کہا۔

میں تم سے کہتی ہوں۔یہاں کبھی دوبارہ نہیں آنا۔اور سیدھے اپنے کنبے اور قبیلے میں جا کر گیدڑ بھبھکیاں مارو۔گیدڑ کا بچہ شیر کی صحبت میں رہ کر بھی گیدڑ کا گیدڑ ہی نکلا۔۔شعر

لوٹتی ہر چیز اپنے اصل کی جانب ہے
شیر کی صحبت بدل سکتی نہیں گیدڑ کو
— غنی غیور



# یہ گھوڑی پانی میں بیٹھ جاتی ہے

افسانہ (مرد کتھا)

مرد فطری طور پر مرد پیدا ہوتا اور عورت بھی عورت ہی جیسی۔میرے ایک دوست نے کہا: تربیت کے ذریعے کمزور دل عورتوں کو مردوں کی طرح دلیر بنایا جا سکتا ہے۔بغیر کسی دلیل کے دوست کی بات کو ٹھکرانے اور رد کرنے کی بجائے مجھے کافی سوچنا پڑا۔مجھے انسانی تاریخ پر ایک نظر دوڑانا پڑی۔صاف صاف عورتوں کے مقابلے میں مجھے مردوں کی برتری و حاکمیت ہی نمایاں دکھائی دی۔میں نے سوچا کہ ایسا شاید مردوں کی سماجی و معاشرتی بالادستی اور افسر شاہی کی وجہ سے ہوا۔پھر میں نے اپنی نظر جنگلی جانوروں اور پالتو بیلوں، بھینسوں، مینڈھوں، مرغوں، بلوں پر دوڑائی۔مجھے بات سمجھ آ گئی ایک ہی ماحول میں نروں کو جسمانی طاقت کے اعتبار سے واقعی ماداؤں کے مقابلے میں بہتر پایا۔

دوست کے سامنے میں نے اپنے سارے دلائل رکھ دیے۔تو اسنے میری بات کو بے چوں و چراں مان لیا۔مرد پیدائشی طور پر مرد ہوتا ہے۔اسکی یہ جسمانی طاقت اور بالادستی اسکی فکر اور سوچ کو بھی مہمیز کرتی ہے۔مرد شجاعت کے کارنامے بہتر سرانجام دے سکتا ہے۔میں نے ’’بل فائٹنگ‘‘ دیکھی ہے اور مرغوں کی لڑائی بھی۔سچ کہتا ہوں میں نے کبھی گائیوں کو باہم مقابلے جیتتے نہیں دیکھا اور نہ ہی مرغیوں کو۔

میرے یار مرد کتھا کی بات کر رہے ہیں تو سنو۔

ایک تھا راجے کا بیٹا......

تمام پرجا اسے راجکمار کہتی تھی اسے فنون جنگ بازی، تیراندازی، گھوڑسواری کی مکمل تربیت دی گئی تھی۔ جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی راجکمار کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ سرحد پر واقع شکار گاہ میں اتفاقاً پڑوسی راجے کی بیٹی سے ہوئی ملاقات محبت میں بدل چکی تھی۔ الوداع ہونے سے پہلے راجکمار نے راجکماری سے کہا: تم اماوس کا چاند ہو۔ میں اماوس کی رات کو تجھے حاصل کر سکتا ہوں۔

چونکہ سرحدوں کے تنازعات کی بنا دونوں پڑوسی راجوں میں زبردست کشیدگی تھی۔ لہٰذا راجکمار اور راجکماری کی شادی شاہی اعزاز سے نہیں ہو سکتی تھی۔

وقت تیز رو دریا کی طرح گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دن اماوس کی رات کے پہلے پہر راجکمار نے اپنی قلمرو کی سرحد پار کی۔ اور ہزاروں خطرات مول لے کر راجکماری کی محل کے سامنے جا پہنچا۔ ادھر راج کماری جو پہلے ہی سے گرمیوں میں پارے کی طرح مضطرب تھی اور چھت پر ٹہل رہی تھی۔ راجکماری ہر اماوس کی رات محل کی چھت پر رتجگہ کیا کرتی تھی۔ راجکماری نے راجکمار کو دور ہی سے پہچان لیا۔ راجکماری نے ایک وفادار پہرے دار کی مدد سے اپنی بادپا گھوڑی کو شاہی اصطبل سے کھلوایا اور سیدھی راجکمار کے پاس پہنچی۔

راجکمار نے راجکماری کو گھوڑی پر بٹھایا اور دونوں ہوا ہو گئے۔ راستے میں ندی پڑتی تھی راجکمار نے جونہی گھوڑی کو ندی میں ڈالا وہ بیٹھ گئی۔ راجکمار نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اٹھ ہی نہیں رہی تھی۔۔ راجکمار نے راجکماری سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟

راجکماری بولی ’’یہ گھوڑی پانی میں بیٹھ جاتی ہے کیونکہ اسکی ماں بھی پانی میں بیٹھا



کرتی تھی۔‘‘

راجکمار کا دھیان اپنی ہونے والی کسی بیٹی کی طرف چلا گیا......

اس نے کھینچ کر گھوڑی اور راجکماری کو ندی سے باہر لایا۔ اور کسی تدبیر سے ندی پار کر کے اپنی ریاست میں داخل ہونے کی بجائے راجکماری کو گھوڑی پر بٹھایا اور واپس اسکے راج محل میں چھوڑ کر الوداع کہا۔

راجکماری نے پوچھا یہ کیا کیا تم نے؟ ہمیشہ کے لئے بچھڑنے والے، غم زدہ راجکمار نے کہا:

’’یہ گھوڑی پانی میں بیٹھ جاتی ہے کیونکہ اسکی ماں بھی پانی میں بیٹھ جایا کرتی تھی۔‘‘

# پاگل خانے کا بابا

(افسانہ)

نہ تو وہ ارقیدس تھا اور نہ ہی دیو جانس کلبی......

کون تھا وہ؟۔ جو برف رت میں ننگ دھڑنگ آوارہ گھوم رہا تھا۔ قیامت کی سردی تھی۔ ہر کسی کے دانت بج رہے تھے۔ جھیلیں جم چکی تھیں۔ یخ بستہ علاقہ میں کہرا چھایا ہوا تھا۔

مگر وہ دریا کی طرح رواں دواں اپنی مستی میں چل رہا تھا۔ کسی خدا ترس رئیس نے اسے پہننے کو کمبل دیا۔ جو تھوڑی دیر اوڑھنے کے بعد اس نے ٹھٹھرتی ہوئی برہنہ جھاڑی پر ڈال دیا۔

اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھی ہوئی تھی گرم و سرد موسموں کے تبدل و تغیر نے اسکی جلد کو کالے پتھروں جیسا سخت بنا دیا تھا۔ اسکی چمڑی اسقدر موٹی ہو چکی کہ وہ بغیر کسی پریشانی کے گرمی سردی جھیل سکتا تھا۔ ہمہ تن کسی کی یاد میں غرق۔ دنیا کے سود و زیاں سے بے خبر۔ آگے بڑھ رہا تھا۔

مندر کے پاس سے گزر رہا تھا دھوپ سینکتے ہوئے ایک بے کار پجاری کو خیال آیا۔ کیوں نہ اس بابے کو کتھا سنا کر چیلا بنا لیا جائے۔؟

پجاری نے جھٹ سے اپنے چیلوں کو بھیجا اور انہوں نے بابے کو پکڑ کر پجاری کے



سامنے پیش کر کیا۔

پجاری نے پوچھا تو ننگا کیوں رہتا ہے۔

بابے نے کہا تھا میں ننگا ہی پیدا ہوا تھا اس لئے ننگا ہی رہتا ہوں۔

پجاری نے کہا تجھے جانا کہاں ہے؟ بابے نے کہا: جہاں سے آیا ہوں اسی طرف جا رہا ہوں۔

پجاری نے ہنس کر کہا۔ تم دیوانے تو نہیں۔ یہ سنکر بابا بھی ہنسنے لگا۔

پجاری نے کہا یہ بابا دیوانہ ہے۔ اسے پکڑ کر لے جاؤ اور پاگل خانے میں داخل کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

پاگل خانے کے پاگلوں نے دیکھا نیا پاگل وارد ہوا ہے انہوں نے اپنے اپنے انداز میں بابے کا استقبال کیا۔

کسی نے سر نیچے جھکا کر سلام کیا اور کسی نے اسکی طرف پیٹھ کر کے کولہے اوپر اٹھا کر۔ کسی نے فوجیوں کی طرح پھرتی سے ٹانگیں نچا نچا کر سلیوٹ کیا۔ وغیرہ۔ پاگل خانے کے اندر بابے نے دیکھا کہ ایک پاگل خالی سیمنٹی اور ٹھنڈے فرش پر لوہے کی مچھر جالی اوڑھے ہوئے سو رہا ہے۔۔

بابے نے پوچھا۔ بھائی یہ کیا اوڑھ رکھا ہے۔

پاگل نے ہنستے ہوئے کہا: خاموش ڈینگی کا خطرہ ہے۔

پاگل خانے کے دن رات میں کوئی فرق ہی نہ تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اپنے اپنے خیال کے مطابق کوئی پاگل جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شاید اسی قسم کے سچ بولنے اور بے تکلفی نے ہی نے انہیں اس گھر کی رہ دکھائی تھی۔

پاگلوں کے سونے کا کوئی وقت نہیں تھا اور نہ ہی جاگنے گا۔ انہوں نے اپنی پوجا

پاٹ کوکسی سمے سے نہیں باندھا ہوا تھا۔ وہ اپنے درپیش مسائل پر گفتگو بھی کرتے تھے اورایک دوسرے کو بیباکی کے ساتھ جواب بھی دیتے تھے۔ٹھٹھے مخول کرتے اور کبھی آہ وفغاں۔

اسی طرح وقت کا پہیہ آگے چلتا گیا اب سردی کا موسم ختم ہو گیا اور موسم بہار میں چڑیاں گھونسلوں کے لئے تنکے اکٹھے کر رہی تھیں۔ شعر

درختوں سے مراسم بڑھ رہے ہیں
پرندے گھر بسانا چاہتے تھے

پاگلوں نے ایک دن پاگل خانے کے احاطہ میں ایک بڑے درخت کے نیچے سنگت کا انعقاد کیا۔

ایک پاگل واعظوں کی طرح لچھیدار تقریر کر رہا تھا اور تقریر کے دوران اسنے کہا

''تمہیں پتہ ہے۔

میں کون ہوں؟''

باقی پاگلوں نے کہانہیں معلوم مگر تم ہو سچے۔

بھاشن دینے والے پاگل نے کہا۔''میں بھگوان کا اوتار ہوں۔'' جب پاپ بڑھ جاتا ہے تو بھگوان اپنا اوتار دنیا میں بھیج کر پاپیوں کو سیدھا رستہ دکھاتا ہے جب پاپی لوگ اسکو نہیں مانتے تو وہ اوتار انہیں مار ڈالتا ہے۔

بعض پاگلوں نے کہا تو سچ کہتا ہے بعض نے احتجاج کیا کہ تو اوتار نہیں ہوسکتا بلکہ ہم جیسا عام مانش ہے۔اسی بحث کے دوران پاگل آپس میں لڑ پڑے۔کافی دیر بعد جب وہ لڑلڑ کر تھک گئے تو ان میں خود بخود صلح ہوگئی۔ پاگلوں کے اوتار نے دوبارہ بھاشن دینا شروع کیا۔ابھی عقیدت مند پاگلوں کی تائید کی آوازیں ختم بھی نہیں ہوئیں تھی کہ آسمان سے ایک زوردار آواز آئی۔



''یہ اوتار کا دعویٰ کرنے والا مانش جھوٹا ہے۔''

''میں نیاسے اوتار بنا کر نہیں بھیجا اور نہ ہی اس پر کوئی پستک یا گرنتھ اتاری ہے۔''

عام پاگلوں کی طرح اوتار کا دعویٰ کرنے والا پاگل بھی ہکا بکا رہ گیا۔

آخر کسی دلیر اور بہادر پاگل نے ہمت کر کے پوچھا تو کون ہے۔؟

درخت سے آواز آئی:''میں تم سب کا بھگوان ہوں۔''

پاگلوں نے کہا: اگر تو بھگوان ہے تو نیچے آتا کہ ہم تجھے قریب سے دیکھیں۔اور تو ہمارا دکھ درد قریب سے سمجھے۔

درخت سے آواز آئی۔

''نہیں اگر میں درخت سے نیچے آیا تو مجھے یہ جھوٹا اوتار پیٹے گا۔'' اسکے بعد سب پاگلوں نے کہا۔ ہے بھگوان...... ہے بھگوان۔۔تو ستیہ ہے ستیہ ہے۔

اسی اثنا میں کھانے کی سیٹی بجتے ہی محفل برخاست ہوئی تو کسی نے دیکھا کہ وہ بابا جولڑائی کے دوران پاگلوں کی مار پیٹ سے ڈر کر پیڑ پر چڑھ گیا تھا۔مسکراتا ہوا پیڑ سے نیچے اتر آیا تھا۔

# پیاز کی گنڈیاں

کچے پیاز اور لہسن سے ملاؤں کو نفرت ہو تو ہو......لیکن میں تو اپنی سلاد جیسی ہر تحریر میں ذات کے پیاز کو شامل کر لیتا ہوں اسکے بغیر الفاظ بے سوادے رہ جاتے ہیں۔ پیاز کے گنڈیوں سے مجھے محبت ہے۔اسی لئے پیازی رنگ بھی مجھے بھاتا ہے۔طنز کی چھری سے جب میں ذات کی گنڈی کو بے باکی سے کاٹتا ہوں تو پیاز کی بو چاروں طرف اڑنے لگتی ہے چھری کے کاٹنے کی چر چراتی آواز کے ساتھ اسکا رس بھی میری آنکھوں سے داد بٹورتا رہتا ہے۔اسی لئے میں ہر ایسی تحریر کو پسند کرتا ہوں۔جس سے آنسوؤں کا پیازی رنگ جھلکتا۔ بلکہ چھلکتا ہو۔

ایک دن جب میں نے کسی سے کہا کہ میرے دوست کی شخصیت پیاز کی گنڈی طرح تہ بہ تہ اپنی ہی ذات کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔تو یہ نادر تشبیہہ سنتے ہی میرے دوست کی نظر،میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی اس نے صدق نیت سے مجھے پہچان لیا۔اور پھر تا دیر میری آنکھوں میں وہ آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا۔

میرے دل میں کئی شکوک نے بیک وقت جنم لیا۔

پیاز اور پھر شخصیت سے تشبیہ۔استغفراللہ۔

مجھے خود بھی یہ جملہ بہت مزاحیہ جیسا لگا۔

لیکن جب اس کو میرے دوست نے قبول کر لیا تو میری رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔



آہا۔آہا۔

کیا نظارہ تھا۔یکا یک پیاز کے ڈھیر سے گنڈیاں اچھلنے لگیں۔پہلے تو انکے الگ الگ جثّے دکھائی دیے۔کوئی جثہ چھوٹا تھا کوئی بڑا۔کوئی ایک ''دلی'' پر مشتمل تھا اور کوئی قدرتی طور پر دو تین دلیوں میں بٹا ہوا تھا۔قدرت کا کرنا کہ میرے دیکھتے دیکھتے ان کے اعضا بھی نمایاں ہوگئے۔جب میں نے اس پیازی مخلوق کو دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔

سماتامک۔مشرق سے تا مغرب،جنوب سے تا شمال میں نے خود کو پیازی مخلوق میں گھرا ہوا پایا۔

میری زباں پر یہ نغمہ تھا۔

اشعار

جدھر دیکھتا ہوں ادھر پیاز ہی پیاز ہے
ہر گنڈی کے سینے میں اک راز ہے
کوئی گنڈی پیدل چلتی ہے شہر میں
صوفی صافی کوئی شکاری آز ہے

پھر کچھ عرصہ کی گرم وسرد کا کیا اثر ہوا؟ کہ اس پیازی مخلوق کے لچکتے ہوئے شفاف جیسے پر نکل آئے۔اور یہ فرشتوں کی طرح آسمانوں کی طرف اڑنے لگی۔میں دیکھتا رہا۔تیز ہواؤں کی سائیش اور رگڑ سے انکے جثوں کی پرتیں اترنے لگیں۔کچھ ہی عرصہ میں یہ بڑی جثہ دار مخلوق چھوٹی سے چھوٹی ہونے لگی۔آخر کار سب کی سب پھر واپس پیاز کی گنڈیاں بن گئیں۔

کل شئی یرجع الی اصله

بہت ہی حیرت کی بات ہے کہ یہ گنڈیاں جمگھٹوں کی شکل میں الیکٹرانک میڈیا کے

ذریعہ سفر کرتی ہیں۔ میں نے بھی موبائل کی سکرین پر ''سم سم ......'' انگلیاں چلائیں تو ''کلوز ڈ ونڈ وسیون'' یعنی سات نمبر کھڑکی ایک دم کھل گئی...... جب میں نے اس سے جھانک کر دیکھا تو مجھے پورا گلوبل ولیج آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگا۔

فیس بک کی وال کے بائیں جانب اوپر ان پیاز کی گنڈیوں کو اپنی اصلی پیازی شکل میں دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی......انکے نام اور پتوں کے علاوہ موبائل نمبر اور ای میل بھی لکھے ہوئے تھے۔ یہ پیاز کی گنڈھیاں انسانوں کی طرح جسم کثیف کی محتاج نہیں بلکہ اپنے غیر مرئی جسم لطیف کے ذریعے روحانیوں کی طرح ایک دوسروں سے ملتی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ ہنسی کھیل علم و دانش کی باتوں کے علاوہ یہ ہر روز پہروں پہروں تبادلۂ خیال کے سلسلے بھی جاری رکھتی ہیں۔ آخر تھک کر تاریک غار میں پناہ گزیں ہو جاتی ہیں۔ عجیب مخلوق ہیں یہ پیاز کی گنڈیاں!



# مامتا

(خصوصی مائکروف)

شاہین اپنے بچوں کو پروں پر بٹھا کر اڑنا سکھاتا ہے اور عام چڑیاں بھی۔ بھینس بیوقوف جانور ہے اگر غلطی سے اسکا پاؤں اپنے بچے پر پڑ بھی جائے تو وہ کبھی اپنا وزن اس پر نہیں ڈالتی۔ سنا ہے کہ ظالم فوجیوں نے جنگل میں تھوڑی دوری پر وادی میں دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے بچے سے کھیلتی ہوئی ریچھنی اور اسکے بچے پر بے مقصد گولی چلادی۔ بعض دفعہ احمق لوگ اس قسم کی ظالمانہ حرکت کو باہمی ہنسی مزاق کے طور پر سر انجام دیتے ہیں۔ ریچھنی کا بچہ فائر کی زد میں آگیا اور تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ ظالم فوجی ہنستے ہوئے گشت کے لئے پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد جب وہ اسی راستے سے آئے تو دیکھا ریچھنی ابھی تک اپنے مردہ بچے کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اس نے ان فوجیوں کو دیکھ کر منہ آسمان کی طرف کر کے زور دار فریاد و زاری کی۔ عجیب و غریب آواز سن کر رکے ہوئے فوجی دریا کے دوسرے کنارے پر ڈر گئے اس کے بعد ریچھنی بے حس ہوگر پڑی۔ تجسس اور حیرت می ڈوبے ہوئے ان نادان فوجیوں نے وہ چھوٹا سا دریا پار کر کے دیکھا کہ وہ ماں اپنے بچے کے پہلو میں مری پڑی تھے۔ بے رحم فوجی ڈر گئے۔ جب وہ واپس پار کر رہے تھے اچانک پانی کا ریلا آیا۔ اور وہ سبھی بہہ کر مر گئے۔ محکمہ موسمیات نے بتایا کہ پہاڑوں پر اچانک بادل پھٹنے اور اور دریا میں باڑ آنے سے پانچ فوجی بہہ کر مر گئے۔

# فرطِ محبت وامومت

(مائکروف)

خزاں کے موسم میں دھرتی بے لباس ہو چکی تھی۔ نرم و سبز پتے جو کبھی شاخوں کا سنگھار ہوا کرتے تھے اور بادصبا میں ہچکولے کھاتے تھے۔ اب وہ پیلے ہو کر گر چکے تھے اور بادخزانی کی ٹھوکروں پر تھے۔ خزاں کے موسم میں جنگلوں میں درختوں کے پیلے پتے جب ڈھلوانوں پر گرتے ہیں تو تندھوائیں انہیں اکٹھے کر کے کھائیوں اور کھڈوں میں پہنچا کر بڑے بڑے ڈھیر بنا دیتی ہیں۔

ایک بھیڑیانی اپنے دو بچوں سمیت شکار کے لئے نکلی ہی تھی کہ دور سے جنگلی کتوں کی دوررس آنکھوں نے انہیں گھیر لیا۔ جنگلی کتوں کے جھنڈ بھیڑیانی اور اسکے بچوں کو مار کھانا چاہتے تھے۔ جنگلی کتوں کے جھنڈ اتفاق واتحاد سے بعض اوقات شیر کو بھی عاجز کر کے مار گراتے ہیں۔

بھیڑیانی اوٹ کا سہارا لے کر بچوں سمیت جلدی سے ایک کھائی میں اتری۔ اور اپنے دونوں بچوں کو سوکھے ہوئے پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا دیا اور وہ خود سمت بدل کر بھاگنے لگی۔ جنگلی کتے مسلسل اوبڑ کھوبڑ ڈھلوانوں پر اسکی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے اسکے بعد بھیڑیانی مزید راستہ بدل کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئی اور زور زور سے



چیخنے لگی۔ اس سے پہلے کہ جنگلی کتے اس کو مار کھاتے۔ ہر طرف سے غراتے ہوئے بھیڑیے آ نکلے۔ اگلے چند لمحوں میں بھیڑیوں نے مل کر جنگلی کتے بھگا دیے تھے۔ اور پھر بھیڑیانی نے اسی کھائی میں اتر کر ایک مخصوص آواز دی۔

پتوں کا بڑا ڈھیر جس میں ہاتھی بھی آرام سے چھپ سکتا تھا کے اندر سے دھیمی دھیمی سرسراہٹ باہر آنے لگی تھوڑی دیر بعد پتوں کے کھڑکار کے ساتھ اسکے بچے صحیح سلامت باہر نکل آئے۔

فرطِ محبت سے جو دودھ بھیڑیانی کے تھنوں میں اتر آیا تھا اپنے خوبصورت بچوں کو پلا کر وہ کسی محفوظ کھو کی طرف چلی گئی۔

# بچے دیواروں پر چلتے ہیں

(مائکروفکشن)

بعض بچے دیور پر چلتے ہیں، حنا بانو نے یہ تو سنا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ تین سال کے بچے حنان کے ساتھ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ جبکہ اس کا شوہر دلآور کسی ضروری کام کے لئے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اور انکا شفیع نامی نوکر زینوں کے نیچے چھوٹے سے سیل میں سو رہا تھا......

رات کو حنا نے دیکھا کہ حنان حیرتناک طور سے کمرے کی دیواروں پر بے خطر چل رہا تھا......اپنے بچہ کی یہ عجیب حرکت دیکھ کر وہ کانپ گئی تھی......بیچ بیچ میں ڈر کے مارے اسکی چیخیں بھی نکل چکی تھیں۔

حنا کی چیخیں سنکر انکا نوکر شفیع دوڑ کر آیا اور اسنے حنا کے بند کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کیا......

وہ گہری نیند سے ایک دم جاگ گئی۔ شفیع نے دروازہ کھلنے پر دیکھا کہ حنا بانو پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی...... شفیع پوچھ رہا تھا......

مالکن کیا ہوا؟

مالکن کیا ہوا؟۔ وہ خاموش بت بنی ہوئی تھی......گویا اس پر کسی بھوت پریت کا سایا پڑ چکا تھا۔



اسی اثنا میں دلآور بھی غیر متوقع طور اپنے گھر آ پہنچا۔ حنا کی پیشانی اور چہرے کو شبنم سے لدے ہوئے پھولوں کی طرح عرق آلودہ دیکھ کر دلآور سخت پریشاں ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک بھی پیدا ہو رہے تھے۔

ادھر انکا نوکر شفیع بھی شرم اور ڈر سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اس سے تو مزید کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔

کمرے میں......شور شرابا سن کر......سارے ماجرے سے بیخبر حنان بھی جاگ اٹھا تھا اور اسکی زوردار قلقاریوں سے کمرے کا عرش وفرش اور در و دیوار چمک رہے تھے۔

حنا نے ہمت کر کے حنان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا......یہ......یہ......ہاں یہی ان دیواروں پر چل رہا تھا، میں اسے دیواروں پر چلتے دیکھ کر ایسی ڈری کہ میری چیخیں نکل گئیں تھیں...... یہ سنتے ہی دلاور خان کی بھی چیخ نکل گئی۔

# کاکروچ

(مائیکروفکشن)

سچ کہتا ہوں۔ یہ آدھی رات کے وقت کا واقعہ ہے جب میں پڑھتے پڑھتے اوب چکا تھا مجھے نیند بھی نہیں آرہی تھی میں بستر پر لیٹ کر اپنے سر کے بالوں کو زور زور سے کھینچ رہا تھا۔سوچتا تھا شاید اسطرح سر درد میں کچھ کمی ہو لیکن سب بے سود۔

میری آنکھوں کے پپوٹے سوجھے ہوئے تھے......اور میں دائیں کروٹ پر حس پڑا ہوا تھا......

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا سرخ کاکروچ فرش پر مارچ کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا...... پتہ نہیں اسے دیکھ کر کیوں میرے اوسان خطا ہوگئے تھے...... بڑھتے بڑھتے آخر وہ میرے چھاتی پر آن چڑھا۔ مجھے اس وقت یوں لگا کہ میں کسی پہاڑ کے نیچے آگیا ہوں...... بدستور بے حس پڑا رہا۔ پھر وہ اپنے کھردرے پاؤں کے ناخن میری جلد میں گھساتا ہوا میرے چہرے پر چڑھ گیا۔دائیں کان کی طرف بڑھا اور کنکول کی طرح کان میں گھسنے کی کوشش کی لیکن کہاں وہ بڑا سا کاکروچ اور کہاں میرے کان کا چھوٹا سا سوراخ......ناکام ہوکر وہ واپس میرے منہ کی طرف پلٹا......سچ مچ مجھے اسکے چلنے سے گدگدی ہورہی تھی اور درد بھی لیکن ڈر سے میرے ہاتھ اور ٹانگیں گویا شل ہوچکی تھیں۔ میں اسی طرح بے حس پڑا تماشا دیکھتا رہا۔آخر وہ



بے رحم میرے گالوں کو لتاڑتا ہوا میرے کھلے ہوئے منہ کی طرف بڑھا......

اتنے میں نے دیکھا کہ میرے سامنے بئر گرائلس (Bear Grylls) کھڑا تھا۔اسنے آگے بڑھ کر کاکروچ کو زندہ ہی چبا ڈالا اور اسکے باقی ماندہ مواد کو پھک سے میرے کھلے منہ طرف تھوک دیا......اسکے بعد مجھ پر بیہوشگی سی طاری ہوگئی۔صبح کو جب نیند کھلی تو واقعی میرے منہ کا ذائقہ خراب تھا۔پتہ نہیں رات کو میں نے کتنے ہی کاکروچ کھالئے تھے۔ہاں کاکروچ۔

# خوفناک آوازیں

(مائکروفکشن)

نیند کے انتظار میں......رات کو بستر پر لیٹا ہوا......میں سوچ رہا تھا۔سائنس نے کتنی ترقی کرلی ہے۔

دیکھو آنتوں کی تو بات ہی نہیں، گردے بھی بدلے جا رہے ہیں۔پھیپھڑے، جگر، ٹخنے، کولے اور ریڑھ کی ہڈیاں وغیرہ بھی......میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں۔اگلے ہی پل میں نے دیکھا کہ میں ایک بڑے سرجیکل ہسپتال میں پہنچ چکا ہوں......

انسانوں کے اس ہسپتال میں جانوروں کی قطاریں دیکھ کر میں نے کچھ وردی پوشوں سے پوچھا......انہیں کہاں ہانکے لئے جا رہے ہو؟

ایک وردی پوش نے ڈانٹتے ہوئے مجھ سے کہا''خاموش......''

''بغیر کچھ بولے دیکھتے جاو......''

ایک طرف بچڑ خانے میں جانوروں کے سروں کو دھڑ سے الگ کرکے مختلف تھیٹروں میں بھیجا جا رہا تھا۔

میں نے کتے اور گدھوں کے سروں والی ٹریوں کا پیچھا کیا......اور دیکھا کہ ایک بڑے تھیٹر میں بیک وقت کئی لیڈروں کی کھوپڑیاں کھولی گئی تھیں......



ساتھ ہی کتوں اور گدھوں کی کھوپڑیوں سے مغزوں کو نکال نکال کر۔مہارت سے ان میں منتقل کیے جا رہے تھے......

اس دن سے لیکر آج اس دن تک۔مسلسل شاہی ایوانوں میں بھوں بھوں اور ڈھینچوں ڈھینچوں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

# سرخ سوالیہ نشان؟

(مائکروفکشن)

ملکہ چیونٹی اور اسکا عملہ......اپنے گرد آلود ہاتھوں کے ذریعہ چہروں، بازوؤں اور پیروں سے گرد جھاڑنا انکا معمول ہے یا پھر......شاید اس حقیر سی مخلوق کا ارتباط و مخابرات کا کوئی ایسا طریقہ ہوگا......خیر

ملکہ چیونٹی اپنی کسی مخصوص عمل یا نظام کے ذریعے موسمی اطلاع حاصل کر لیتی ہے اور پھر اشاروں کی زبان سے کچھ پیغامات وہدایات، راستوں پر تعینات چلتی پھرتی چیونٹیوں کے ذریعہ ہر بل تک پہنچ جاتے ہیں۔

پھر کیا ہوتا ہے؟ اگلے کچھ منٹوں میں فوج در فوج، قطار در قطار، چیونٹیاں اپنے انڈے اور اشیاء خوردنی دوسرے محفوظ بلوں میں منتقل کرنا شروع کر دیتی ہیں اور آنے والے طوفان اور سیلاب سے بہت پہلے اپنا کام مکمل کر کے سکھ کا سانس لیتی ہیں۔

یہ سلسلہ اور تکنیک نئی نہیں۔ بلکہ ان میں پیڑیوں سے چلی آ رہی ہے۔

لیکن ایک ہم غیر منظم انسان ہیں کہ اس جدید ٹیلی مواصلات، برقی سلسلہ پیام رسائی، ریڈیو۔ راڈار اور سیٹلائیٹ کے علاوہ جاسوسی کارکنوں کھوجی تنظیموں اور تھانگی نظام کے ہوتے ہوئے بھی اپنے محترم شہریوں اور معصوم بچوں کو خودکش بم دھماکوں سے ہلاک ہونے سے نہیں بچا سکتے۔ میں سمجھتا ہوں......انکے ہر چیتھڑے جسم سے رستا ہوا خون کیسے انسانی حکومت وآئین کے ماتھے پر سرخ سوالیہ نشان ہے؟



# رات اور بھوت

(مائکروفکشن)

پرانی بات ہے کہ ہمیں بچپن میں رات کے وقت گھر سے باہر جانے کی سخت ممانعت تھی۔ چونکہ پہاڑی علاقوں میں لوگوں کے گھر دور دور واقع ہوتے ہیں۔اس لئے جنگلی جانوروں کے علاوہ جن بھوت وغیرہ سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔کئی جوان لڑکیوں کو جن اٹھا لے جاتے تھے۔لہذا بچوں کو سخت ہدایتیں تھیں کہ شام کے بعد گھر سے باہر بالکل نہیں نکلنا......

غالباً میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ایک بار رات کے وقت جسارت کر کے میں گھر کی چھت پر چڑھ گیا۔ان دنوں گاوں میں بجلی کا نام ونشان بھی نہیں تھا...... پہلے ہی قدم پر میں نے چھت سے دیکھا کہ ہمارا گھر اندھے کنویں میں ڈوبا ہوا ہے...... روشنی کا کہیں نام ونشان بھی نہیں......گھر کے چاروں طرف سیاہ چادریں اوڑھے ہوئے دیوقامت لوگ ''شاں شاں'' کر رہے تھے۔ڈر کر میں نے نظر اوپر اٹھائی اور ڈرے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔کئی بڑی بڑی کوہان والے اونٹ کھڑے دکھائی دیے۔تاریکی میں مجھے ان کے کوہانوں اور پیٹھوں پر درختوں کی طرح بڑے بڑے بال بھی دکھائی دئے۔صبح کو اٹھ کر چھت پر گیا تو میرے گاؤں کے اطراف کی پہاڑی چوٹیاں مجھ پر ہنس رہی تھی،سورج ناک نکال چکا تھا اور میرے گھر کے اردگرد پیڑ پودے ہوا کے جھونکوں سے ہل جل رہے تھے۔

# زنانہ تکرار

(مائکروفکشن)

پہاڑوں پر برفباری شروع ہوتی ہے تو پھر......مہینوں مسلسل ہوتی رہتی ہے آخر مطلع صاف ہوتے ہی دھوپ لگنے پر برفشار یا برف کے بڑے اور چھوٹے کڑاڑے چلنے شروع ہوجاتے ہیں لیکن پہاڑی ڈھلوانوں پر برف کے ڈھیر کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ایک دن آخر کھسکتے کھسکتے، پگھلتے پگھلتے ختم ہو ہی جاتے ہیں۔

اس طرح مون سون بارشیں بن بلائے مہمانوں کی طرح آسمان سے نازل ہوتی ہیں......سوکھے برساتی نالے جو تھار کی طرح بے آب و گیاہ دکھائی دیتے ہیں میں اچانک وارد ہوتی ہیں۔ ان میں باڑ دیکھ کر حیرانی تو آپکو بھی ہوتی ہوگی......لیکن آسمان کی یہ وبائی اسہال بند ہوتے ہی ان برساتی نالوں میں دوبارہ جھینگرا چھلنے کودنے لگتے ہیں اور ادھر ادھر سے آزادہ رو چھپکلیاں آکر چلنے پھرنے لگتی ہیں۔

گویا ہر پھیلنے والی وبا ایک دن اپنے ہدف کو چھوڑ کر یا ساتھ لے کر ختم ہوجاتی ہے لیکن ایک زنانہ بحت بحث و تکرار ہے جو کوئی بھی موسم ہو کبھی ختم نہیں ہوتا۔



# گھورے پر اگے ہوئے پھول

(مائیکروفکشن)

شہر کے مضافات میں بڑا سا گھورا ہے۔ جہاں گوبر ہی گوبر دکھائی دیتا ہے......بہار کا پیامبر کیا آیا کہ اسکی نوید حیاتِ نوسن کر پتھروں کی دراڑوں سے بھی امید افزا پتیوں نے سر نکالنے شروع کردئے۔ پتہ نہیں ان میں بیج کونسی مور سیاہ نے چھپا رکھے تھے کہ ابر نیساں کی نمی نے یہ کرشمہ دکھائے ہیں۔

ادھر گھورے کے ڈھیر میں سے بھی کئی قسم کے پودے نکلے ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک پودے پر نامعلوم قسم کے مگر نہایت خوبصورت پھول کھلے ہیں۔

اس پودے کی چوٹی پر لگا ایک پھول سب سے موٹا اور خوبصورت روشنی کی کثرت اور وافر غذا نے اسے کچھ زیادہ پرکشش بنادیا ہے۔ لیکن گل فروش عورتیں جو مندروں کے باہر پھولوں کی مالائیں اور طبق لے کر بیٹھی رہتی ہیں......اسطرف نہیں آتی۔ ادھر ادھر گزرنے والے گل چین بھی رک کر انہیں دیکھتے ہیں پھر ادھر دیکھ کر سر نیوڑھائے کہیں چلے جاتے ہیں......

شاید یہ پھول مندر کے دیوتاؤں کی بھینٹ نہیں چڑھ سکتے اور نہ ہی شرفاء کے گھر کی زینت بن سکتے ہیں۔ گھورے پر اگے ہوئے پھول جو ہوے......

# غنی غیور صاحب کی فسوں کاری اردو نثر میں ایک خوشگوار اضافہ

غنی غیور صاحب سے میرا تعارف خلائے رابطہ برقی / cyber space میں ہوا اور ماشاءاللہ یہ قلمی و غائبانہ تعارف با قاعدہ ایک رشتے کی شکل گہرا ہوتا چلا گیا۔ان کے کئی افسانے مختلف فورمز پر پڑھتے ہوئے یہ احساس قوی ہوتا چلا گیا کہ ان میں ایک مہارت اور فنکاری سے لبریز افسانہ نگار چھپا بیٹھا ہے جو اپنی جلوہ نمائی کسی بھی وقت بھر پور طریقے سے کرنے کو بیتاب ہے۔ذخیرۂ الفاظ، پلاٹ، بُنت، اٹھان، نقطۂ عروج اور انجام، ان تمام ناگزیر اجزائے افسانہ نگاری میں کوئی بھی ایسا جُز نہیں جس میں کہیں ان کی تحاریر میں ہلکا سا سُقم بھی پایا جائے۔کچھ موضوعات ایسے ہیں جن پر ہمارے ثقافتی پس منظر کے حوالے سے بحث ہو سکتی ہے لیکن ایسے موضوعات کو بھی غیور صاحب نے چابک دستی اور کمال قلمکاری سے برت کر اپنے سچے لکھاری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔قاری کو غیر محسوس طریقے سے ساتھ لے کر چلنا اور وقفے وقفے سے اسے چونکاتے ہوئے کہانی کا دامن مزید طاقت سے پکڑے رہنے کی یاد دہانی کرانا ایک کامیاب قلمکار کی نشانی ہے جو غنی صاحب کو فطرت نے کھلے دل سے ودیعت کی ہے۔

غنی صاحب کا قابلِ رشک علم ان کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکتا ہے اور علم کے جن شعبوں سے ان کی گہری دوستی ہے ان میں دین، تصوف، اساطیریات، معاشیات، سماجیات، انسانیات، نفسیات، فلسفہ، شعر و سخن اور جدید ٹیکنالوجی جیسے



متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اور وہ نہایت مہارت سے ان علوم کو حسبِ ضرورت ایک خاص تناسب سے اپنی تحریروں میں گھول کر یکسانیت کا سدّ باب کرتے ہیں۔

فطرت اور حسنِ فطرت ان کی تحریروں کا بہت بڑا موضوع و جز ہیں اور اس کا ثبوت ہمیں ''دو چمتکار'' اور ''دیہات کی طرف مہاجرت'' جیسی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔تاہم منطقی بُنت ان کی کہانیوں کا شاید نمایاں ترین پہلو ہے اور اسی باعث انسانی نفسیات بھی ان کی تخلیقات کا جُز وِ لاینفک بن جاتی ہے۔اس سلسلے کی بہترین مثال ''مامتا'' اور ''بے دماغ گدھا'' ہیں۔ان کہانیوں میں طنز کا نشتر بے رحمی سے نہیں تو کم از کم بیباکی سے ضرور استعمال کیا گیا ہے۔غنی صاحب روایتی طویل اور جدید طرز کے مختصر افسانے یا مائیکروف (مائیکرو فکشن کے لئے وضع کی گئی شفقت محمود صاحب کی اصطلاح) یکساں مہارت اور روانی سے لکھ لیتے ہیں اور لکھتے وقت ہر ممکن حد تک غیر جانبدارانہ اور بے لاگ انداز اختیار کرنا ان کے قلم اور اندازِ بیان کی مخصوص شناخت ہیں۔

علامت نگاری کے جراثیم کی نشو و نما بھی غنی صاحب نہایت دلجمعی سے کر رہے ہیں اور یقیناً یہاں بھی ان کے گھوڑے پر آنکھیں بند کر کے لوگ شرط لگایا کریں گے۔

میرا ایک بالکل ذاتی اور مخلصانہ مشورہ ہے کہ غنی صاحب کو تنقید نگاری کے ساتھ بھی رشتے کی بات پکّی کر لینی چاہئے کیونکہ ان کے تجزیوں کی پختہ کاری بھی بہت شاندار ہے۔

امید ہے غنی غیور صاحب اسی طرح اچھوتے اور انوکھے موضوعات کو اپنے مخصوص اور منفرد لہجے میں سپردِ قرطاس کرتے رہیں گے اور اردو نثر اور اختصار نگاری کے وسیع شعبوں میں ایک بڑا اور معتبر نام بن کر ابھریں گے۔

ڈاکٹر افتخار الحق (لاہوری)

# تاثرات اور آراء

(سوسل میڈیا میں وقتاً فوقتاً میری کہانیوں پر نیچے دیے گئے تاثرات اور آراء کے لئے میں ان تمام نامور ادباء کرام اور احباب عظام کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔غنی غیور)

ہمارے عہد کے مشہور و معروف افسانہ نگار مشرف عالم صاحب نے میری کہانی ''سیلاب زدہ بستیاں'' پر یہ تأثرات دیے ہیں۔

''دراصل یہ چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں۔انہیں پڑھتے ہوئے وہی لطف آیا جو بورخیس، رسول حمزہ توف، سعدی شیرازی، خلیل جبران کی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ دلچسپ یہ کہ غنی غیور صاحب نے ان کہانیوں کی گانٹھوں کو کشمیر اور ہندوستانی تہذیب سے استفادہ کرتے ہوئے اس خوبصورتی اور مضبوطی کے ساتھ باندھنے کی کوشش کی ہے کہ اختتام آتے آتے خود بہ خود واہ واہ کی صدائیں بلند ہو جاتی ہیں......نہ یہ افسانچے ہیں نہ مائکروفکشن...... یہ زندگی کی لہروں پر ہچکولے کھاتے، جگمگاتے شکارے ہیں...... ایسی حکایتیں ہمارے درمیان سے گم ہوتی جا رہی تھیں......غنی غیور صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ہمیں دوبارہ حکایتوں کی خوبصورت وادیوں کی سیر کرالائے۔''



سرمد کا قتل اور صوفی کی موت پر آزاد کشمیر کے مشہور و قد آور بزرگ ادیب شاعر و صوفی سید ظفر شاہ کاظمی صاحب لکھتے ہیں۔

''فرقۂ ملامتیہ کی روش میں ان پر بحث کا کو مقدمۂ صغرا قائم نہیں کیا جا سکتا۔

حلاج کے بلیک وارنٹ پر جب جنید نے دستخط کیے تو سب نے کہا حضرت یہ کیا فرمایا میں نے ظاہرا'' یہ کیا لیکن باطنی طور پر میں اس سے متفق ہوں۔

اور ابوبکر شبلی نے اس تختہ تلے نماز ادا کی۔

کچھ بھی ہو شریعت بحرحال مقدم ہے اور ان لوگوں نے بھی شریعت مصطفےٰ کے سامنے سر تسلیم خم کئے

اللہ انکی مغفرت فرمائے اور انکے درجات بلند فرمائے''

لاہور سے ڈاکٹر افتخار الحق صاحب نے میری کہانی ''آوارہ گدھا اور مقدس بیل'' پر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

''عمدہ کہانی ہے۔حیوانی و انسانی نفسیات کا موازنہ کامیابی سے کیا اور وہ بھی کمال روانی سے کسی جاندار کا بیجان شے کی طرح ناقدری اور عضوِ معطّل کے طور پر برتنا بنیادی کاروباری ذہنیت کی عکاس ہے انسدادِ بےرحمیِ حیوانات یا میونسپلٹی کے کارکنوں کی ڈرامائی آمد نے کہانی کو اور مضبوط کر دیا وقت کی سردمہری، بےلحاظی اور بےرحمیِ کے سامنے حیوان و انسان برابر ہیں، بس انسان مستقبل کی پیش بندی میں اپنا حال قربان کر دیتا ہے اچھی اور کامیاب کہانی ہے۔''

لاہور سے محترمہ بشریٰ خاتون نے میری کہانی ''چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ'' پر یہ رائے دی ہے۔

’’خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔امن و آتشی کے فقدان کا شکار یہ دنیا اور سکون سے نابلد یہ زندگی واقعی اب اس نہج پر آن پہنچی ہے کہ نفس مطمئنہ کی طالب ہے اور فی زمانہ ایک مجاہدے اور نفسی ریاضت کے بنا یہ سب ناممکن ہے۔بہتر یہی ہوگا کہ ہم اپنے اپنے نفس اور طریق زندگی کی اصلاح کریں۔کبھی کبھی چرند پرند کی خدمت سے بھی انسان قرب الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر بشریٰ خاتوں صاحبہ کا خیال ہے۔۔

’’داستان طرازی......فی زمانہ یہ فن مفقود ہوتا جا رہا ہے لہذا اس کے فروغ کے لیے آپکی کاوش قابل ستائش ہے۔‘‘

میری کہانی ’’پچھلا حساب‘‘ پر بھی بشریٰ خاتون صاحبہ نے رائے دی ہے۔

’’وقت نے ایک سہولت ہر مسلمان کو دے دی ہے جسکا من حیث القوم ہم سب بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور وہ سہولت ہی Religion in Modification دراصل اب مذہب ملائیت کی بھینٹ چڑھنے عیسائیت اور ہندوازم کے رنگ میں رنگنے کے بعد جس قدر رہے وہ بھی ہمارے رحم وکرم پر ہے......مطالعے اور تحقیق کی کمی اور مولوی کی اجارہ داری نے مذہب کے ساتھ سوتیلی ماں والا سلوک روا رکھا۔ اللہ کرے اب ہم انکی مزید دست برد سے محفوظ رہیں۔‘‘

لاہور سے جید عالم ڈاکٹر افتخار الحق صاحب نے میری کہانی ’’پنجرے کا قیدی‘‘ پر یہ رائے دی ہے۔

’’اچھی مختصر کہانی ہے۔ایک اہم سماجی موضوع اور مسئلے کی نشاندہی کہانی کو کامیاب کرتی ہے۔رسمی تعلیم میں اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کے لئے درکار ایک طویل عرصہ زیادہ تر



لڑکیوں کے سلسلے میں مسئلہ ہی بنتا ہے۔نسبتاً پختہ عمر (جسمانی و ذہنی) کی لڑکیوں کو بیشتر لڑکے اور ان کے گھر والے ترجیحی نظر سے نہیں دیکھتے۔حالانکہ ایسی لڑکیاں کہیں بہتر بیوی اور ماں ثابت ہوتی ہیں۔پھر ایسی اعلیٰ تعلیم یافتہ بچیوں کی بسا اوقات نہایت عدم مطابقت والے مرد سے شادی مزید پیچیدہ مسائل کو جنم دیتی ہے، جیسا کہ یہاں ایک امیر زادے کو دکھا کر بتایا گیا کہانی اس لحاظ سے نسوانی تحریک کے زمرے میں بھی بآسانی آجاتی ہے......‘‘

مشہور و معروف افسانہ نگار نعیم بیگ صاحب نے ’’بلی اور چوہے کی کہانی‘‘ پر رائے اور تاثر کچھ یوں دیے ہیں......

’’بلی اور چوہوں کی علامت میں مصنف نے عصری علاقائی جبر واستبداد اور مظالم پر جو تصویر کھینچی ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے......

بلی کے استعارے میں ہم نیتاؤں سے لیکر ہر اس ظالم کو کھلی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں جو عوام الناس اور نہتے انسانوں کو چوہوں کی طرح شکار کرتے ہیں۔‘‘

میری کہانی ’’دو مفرور لڑکے‘‘ پر خطۂ پیر پنجال کے ابھرتے ہوئے ادیب سکالر و نوجوان ڈاکٹر لیاقت علی ناہید صاحب نے اپنی رائے کچھ یوں دی ہے۔

’’مختصر کہانی کے مختلف پہلو ہیں......ابتدا میں مزاحیہ انداز‘‘ اس کی حالت پر رحم آیا اور اسے پٹنا شروع کر دیا......‘‘ ’’آدمی ہوں لیکن ہوں نہیں......‘‘ وسط میں مافوقی دنیا میں لے جاتے ہیں’’ کیونکہ میں دیوتاؤں یا خداؤں کی طرح اکیلا ہی اڑنے پر قدرت رکھتا ہوں لہذا میں اس زمینی پیداوار کے بوجھ کو کہاں تک ڈھوتا پھروں۔‘‘